تحقیق کے طریقۂ کار

ڈاکٹر ش، اختر

تحقیق کے طریقۂ کار

مصنف : ڈاکٹر ش۔ اختر

تعداد اشاعت : پانچ سو

طباعت : تاج پریس باری روڈ گیا

کتابت : قمر نظامی، گیا

ناشر : سینٹر فار سائنٹی فک اسٹڈیز اینڈ کلچر
کے، ۱۰۶ ایچ۔ اس۔ ایل کالونی
رانچی ۲

قیمت : ساٹھ روپے

ملنے کا پتہ

سنٹر فار سائنٹی فک اسٹڈیز اینڈ کلچر
کے، ۱۰۶ ایچ۔ اس۔ ایل کالونی
رانچی ۲

اِنتساب

ذیشان فاطمی

اور

موسی رضا

کے

نام

ترتیب

———

دیباچہ

اُردو میں تحقیق و تنقید کی روایت بہت پُرانی ہے۔ لیکن تحقیق کے طریقۂ کار پر اہم کتابیں نہیں کے برابر ہیں۔ ہمارے جیّد محققوں نے بھی اُردو تحقیق کے طریقہ کار کو سماجی علوم کی روشنی میں سائنٹفک بنانے کی کوشش نہیں کی۔ دانش گاہوں میں زیادہ تر تحقیقی مقالہ ایسے حضرات کی نگرانی میں داخل کیے جاتے ہیں جنھیں اس علم کی کوئی واقفیت نہیں۔ اس کی ذمہ داری صرف اساتذہ کرام پر عائد نہیں ہوتی بلکہ اُس تعلیمی نظام پر بھی عائد ہوتی ہے جس نے مُلازمتوں کی ترقی کے لیے مضحکہ خیز شرائط لازمی قرار دی ہیں۔ انگریزی اور ہندی زبانوں میں تحقیق کے اصول اور طریقۂ کار پر درجنوں معیاری کتابیں مِل جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں ریسرچ کے طریقۂ کار کو نصاب میں شامل کردیا گیا ہے۔ اس لیے اساتذہ کرام اُن سے غافل نہیں رہ سکتے اور اسکالر کو موقع ملتا ہے کہ وہ اصول و ضوابط سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کرسکے۔

میں نے مختلف سیمنار میں تحقیق کے طریقۂ کار کو نصاف کا ایک جزو بنانے کی پُر زور وکالت کی۔ لیکن اس کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کرنے کے باوجود ابھی تک زیادہ تر دانش گاہوں میں یہ اعلیٰ تعلیم کا ایک حصّہ نہیں بن پایا۔ یہ بات ہمارے اساتذہ کرام کی سمجھ میں نہیں آتی کہ سماجی علوم کی روشنی میں تحقیق کے جدید طریقۂ کار کا مطالعہ کیا جانا ضروری ہے۔

ہمارا تخیئل کتنا ہی بلند پرواز کیوں نہ ہو ، ہماری تخلیقی صلاحیت کیسی ہی اعلیٰ اور ارفع کیوں نہ ہو ، اگر وہ حقایق سے غافل ہیں، مشاہدات سے محروم اور موضوعات سے آشنا نہیں تو حقیقت کو پیش نہیں کر سکتی ۔ تحقیق صرف اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے سہارے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کے لیے صداقتوں کا علم اور گہری ریاضت درکار ہوتی ہے۔ سلیقہ، منظم اور اُس فکر و نظر کی شرط لازمی ہے جو موضوعات سے وابستہ حقیقتوں کو یک جا کر سکے اور تنقید و تجزیہ کے بعد فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائے۔

ادبیات میں تحقیق زیادہ تر تنقید و تجزیہ تک محدود ہو جاتی ہے۔ اب اس حصار کو توڑنا ہے۔ جدید تحقیق اساطیر، روایات اور داستانوں کو غیر تاریخی اور ہوائی کہہ کر نظر انداز نہیں کرتی۔ یہ بات دل چسپی سے پڑھی جانی چاہیے کہ پراکرت کہانیوں میں اُن اساتذہ کرام تک کا ذکر ہے جو ایک خاص شہر میں کھانا پکانے کی تعلیم اور ٹریننگ دیا کرتے تھے۔

سنسکرت میں مطبخ اور کھانے پر تحریری ادب بھی ملتا ہے۔ کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پراکرت کہانیوں کے مصنفین کی ذہنی اُپج کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن میسور میں کھدائی کے دوران ملی پلیٹوں کے بالائی نقوش کو دیکھنے سے پتہ چلا کہ ایک گاؤں AGRAHARA میں (یہ گاؤں برہمنوں کو تحفہ کے طور پر دیا گیا تھا)، بہت سے اساتذہ کرام مختلف موضوعات کی تعلیم کے لیے رہا کرتے تھے۔ انھیں میں مطبخ اور لذیذ ترین طعام کی تعلیم دینے والے اُستاد بھی تھے۔ اب ان پُرانی کہانیوں کی تحقیق و تنقید نہ صرف دل چسپ معلومات کا سبب بنتی ہے، بلکہ ہماری صدیوں پُرانی تہذیب کو بھی سامنے لاتی ہے۔ اس کی مدد سے ہم انسانوں کی قدیم تہذیبی داستان اور تاریخ کا

ازسرنو مطالعہ کرتے ہیں۔

اس طرح یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ سنسکرت ادب کا ترجمہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں ہوا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ دوسری ہندوستانی زبانی میں لکھا گیا ادب، بھی سنسکرت زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔ مثال کے لیے ہندی ادب کے اسکالر عام طور سے سمجھتے ہیں کہ SATASAI OF BIHARI سنسکرت میں تخلیق کیا گیا۔ پھر بعد میں برج میں، لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا۔ لیکن جب ایک ریسرچ اسکالر ORIENTAL INSTITUTE, BARODA گیا اور ڈاکٹر B. J. SANDESARA نے اُسے وہ مسودہ دکھایا جس سے ثابت ہوا کہ ARYAGUMPHA OF HARI - PRASADA اور SRNGARA - SAPTASATI OF PARAMANDA جیسی تخلیقات پہلی بار سنسکرت میں نہیں لکھی گئی تھیں، بلکہ وہ "بہاری" کا سنسکرت ترجمہ ہیں تو تحقیق کے نئے دروازے کھلے۔ اسی طرح کلاسیکی ادبیات کے اسکالر کو یہ جاننا چاہئے کہ مشہور پراکرت ANTHOLOGY OF HALA, پراکرت کا ترجمہ ہیں ——— اور DODHAKA VRTTI ایک راجستھانی نظم VELIKISAN RUKMINRI (جس کے خالق پرتھوی راج تھے) کا بھی سنسکرت میں ترجمہ ہوا۔ لیکن عام طور سے ہمارے اسکالر انھیں سنسکرت میں لکھی گئی تخلیقات سمجھتے ہیں۔

جدید تحقیق کا ایک بڑا فرض یہ بھی ہے کہ اعلیٰ ادبیات کے ذخیروں کا بغور جائزہ لے۔ تاکہ نئے حقایق سامنے آئیں اور ہماری تہذیب و ثقافت کا

نیا باب کھُلے۔ لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ریسرچ کے طریقۂ کار کا علم نگراں اور اسکالر دونوں کو ہو۔ میں نے اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ طریقۂ کار سے متعلق ساری باتیں تفصیل سے سمٹ آئیں۔

جدید ادبی تحقیق کا تاریخ، لسانیات اور بشریات سے گہرا تعلق ہے۔ اس لیے روایتی طرز تحقیق جو انیسویں صدی سے بیسویں صدی کی پانچویں دہائی تک بہت مقبول رہی، اب بے معنی ہوگی۔ اس نے اپنا رشتہ سائنٹفک طریقۂ کار سے جوڑ لیا اور سماجی علوم کی مدد سے ادبی سرمایہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہاں فنِ نقد اُن کی رہنمائی بے شک کرتا ہے۔ لیکن خود تنقید موجودہ دور میں مختلف ڈسپلن کے مطالعہ کی محتاج بن گئی ہے۔ اس لیے کلاسکی طرز تحقیق سے اُردو کے اسکالر اور محقق کو نجات حاصل کرنی چاہیے۔ انھیں نئی روشنی اور نئے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ دوسری زبانوں میں تحقیقی سرچشموں کی طرف رجوع ہونا ہے اور قدیم کلاسکی ادبیات سے اپنا رشتہ اُستوار کرنا ہے۔ کیوں کہ ان ہی کے ذریعہ قیمتی تہذیبی اور ادبی اطلاعات حاصل ہوسکتی ہیں۔ اگر انھیں تدوین میں دل چسپی ہے تو بڑی اسکالرشپ کی ضرورت ہوگی۔ کیوں کہ شہادتوں کو حاصل کرنا اور سچ کو بے نقاب کرنے کے لیے نہ صرف مطالعہ کی ضرورت ہوگی بلکہ اعلیٰ ترین ذہنی اور علمی استعداد کی شرط بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

ادب کا زمانہ سے رشتہ قائم کرنا یا یہ بتانا کہ تصورات اور نظریات کی تاریخ کیسے بنتی ہے۔ سماجی علوم سے براہ راست رشتہ کا مطالعہ ہے یہ سب سماجی تاریخی دستاویز ہیں۔ اس لیے ان پر تحقیق اُس گہرے سماجی شعور کے بغیر ممکن نہیں۔ جو مختلف علوم کی دین ہوتا ہے۔ ریسرچ میں منطق

اور استدلال محض جمالیات کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس طرح لسانیات کا علم تحقیق کے نئے دروازے کھولتا ہے۔ یہ نیا علم بے حد تکنیکی ہو گیا ہے۔ موجودہ دور میں اس کے ذریعہ شاعری تئے معنی و مطالب بیان کرتی ہے۔ حالاں کہ شاعری کی لسانیاتی نقطۂ نظر سے جو تنقید کی جاتی ہے وہ بہت مقبول نہیں ہے۔ پھر بھی اس طرز تحقیق کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جانا چاہیئے۔

میں نے اپنی کتاب میں اس کی کوشش کی ہے کہ ریسرچ کے جدید طریقۂ کار کی وضاحت کروں اور اُردو دُنیا کو تحقیق کے جدید طریقۂ کار کے تقاضوں کا احساس دلاؤں۔ اس سلسلہ میں میں نے انگریزی کتابوں سے فیض حاصل کیا۔ اُن کے مطالعہ نے مجھے تحقیق کے دشوار مسئلوں کو سمجھنے میں مدد دی۔ انگریزی زبان میں اس موضوع پر درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہندی زبان بھی پیچھے نہیں۔ البتہ اُردو میں ایسی مبسوط تصنیف نہیں ملتی۔

میں نے اس کتاب میں انگریزی اصطلاحوں کا اُردو میں ترجمہ نہیں کیا۔ ترجمہ اپنی جگہ ایک مکمل فن ہے۔ خصوصیت سے تکنیکی الفاظ اور اصطلاحوں کے ترجمے آسان نہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہیں نہ کہیں یہ کام ہو رہا ہے۔ اس لیے دوسرے حضرات اس کی طرف توجہ دیں گے۔

میں محقق بھی نہیں ہوں۔ تحقیق سے میری دل چسپی نہیں کے برابر ہے۔ لیکن اپنی ملازمت کے دوران میں نے تحقیق کے طریقۂ کار کی ضرورت اور اہمیت کو برابر محسوس کیا اور اس بات کا منتظر رہا کہ کوئی صاحبِ علم اس طرف رجوع ہوں گے۔ بدقسمتی سے یہ کام ایسے فرد کو کرنا پڑا جسے

اپنے " ذی علم محقّق " ـــــــ ہونے کا کوئی بھرم نہیں۔ اس لیے
میں اُن تمام حضرات کا ممنون ہوں گا جو اس کتاب کے کمزور ترین
پہلوؤں کی طرف میری توجہ مبذول کرائیں گے۔

ڈاکٹر ش۔ اختر

باب اوّل

تحقیق کی تعریف

تحقیق جدید علم نہیں ہے اس کا تعلّق قدیم انسانی زندگی سے بہت گہرا ہے۔ اس کی ابتدا کا مسئلہ بھی، انسان کی ابتدا کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری تہذیب و تمدن کے ارتقائی سفر میں اس کی حیثیت رہنما کی رہی ہے۔ وہ کرید اور جستجو جس کے لیے یہ خاکی پیکر کبھی لعنت و ملامت کا سبب بنا۔ آج بھی کائنات کی تسخیر اور فطرت کی پوشیدہ طاقتوں کو اپنی دسترس میں کرنے کا ہُنر اسی سے سیکھتا ہے یہی وہ جبلّی طاقت ہے جو ارتقائی سفر کو جاری رکھنے کے لیے نسلِ انسانی کو مجبور کرتی رہتی ہے۔ کسی شئے کو جاننے کی خواہش فطری ہے بلکہ اُس کے ماضی کی، تلاش و حصول کو اپنا مقدر تصور کرتی ہے۔ تحقیق و تنقید کی اس دولت نایاب نے انیسویں صدی میں ایسے افراد کو دنیا کے سامنے پیش کیا جنھوں نے سینکڑوں برسوں کے فلسفیانہ نظام اور نظریات کی چولیں ہلا دیں۔ مقدس روحانی رشتہ ٹوٹ گئے۔ حیاتیاتی نظام کا تار و پود بکھر گیا اور ہماری معاشی، نفسیاتی اور حیاتیاتی زندگی کو ایک نئی منزل کا سُراغ ملا۔ لہٰذا تحقیق کی ہر شعبۂ علم میں اہمیت ہے۔ خصوصاً سائنس اور

سماجی سائنس کی دشوار راہیں اس کے بغیر طے نہیں ہو سکتی۔ وہ علوم جن
کی طرف بیسویں صدی میں توجہ دی گئی تحقیق کے رہین منت ہیں۔ نفسیات
جیسے ہنوز اہم علم بنتا ہے ہر قدم پر تحقیق کی محتاج ہے۔ یہ شعور کا کوئی نازک
نکتہ ہو یا لاشعور کی گتھیاں یا ہماری پیچیدہ جبلّتیں سب اس کے دائرہ
میں آتی ہیں اور شب و روز دنیا کے مختلف مراکز میں اہل علم اس کی تحقیق
و تنقید میں مصروف ہیں۔ اس لیے ہم بیگانہ محض رہ کر جدید انکشافات سے دور
نہیں رہ سکتے۔ ہمیں اپنے مزاج کو کسی حد تک یقینی تحقیق سے مانوس رکھنا
پڑے گا۔ قدیم ادب میں تحقیق کے مسائل کا ذکر بہت کم ملتا ہے اور اگر تحقیقی
کاوشوں کا جائزہ لیں تو ہمیں مایوسی کا بھی احساس ہوگا۔ ان دنوں البتہ
اس کا بازار بہت گرم ہے۔ اس کی بہت سی وجہیں ہیں۔ یوں تحقیق کے متعلق
اکثر و بیشتر اب بھی مضحکہ خیز باتیں سنائی دیتی ہیں۔ لیکن یہ مضحکہ خیز گفتگو
سنجیدہ ذہن کی آئینہ دار نہیں ہوتی۔ تحقیق کے متعلق پروفیسر BONAMY
DOBREE نے ایک بڑی خوب صورت بات یہ کہی:

"Research is the PUREST blessing that
We know" ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ محض اعداد و شمار اور مضحکہ خیز
واقعات کا مطالعہ نہیں ہوتا۔ اصل شے اس حقیقت میں مضمر ہے کہ معلومات کے
پیچھے جو علم کی معرفت اور دانش وری چھپی ہے اُسے حاصل کیا جائے۔ اس کے
بغیر آج کی تکنیکی دنیا کی ترقی ممکن نہیں۔ لہٰذا تحقیق اور اس فن میں مہارت
حاصل کرنے کی ضرورت وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

ریسرچ کے عام معنی حرکت کے ہیں۔ یعنی جانی پہچانی ہوئی شے سے انجان
کی طرف یہ حرکت ذہن کو مرکوز کرتی ہے۔ اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ جب ہمارے سامنے

نگراں اور اسکالر دونوں کسی موضوع پر تحقیقی دُنیا میں مصروف نظر آتے ہیں تو دونوں ہی موضوع تحقیق سے کماحقہٗ آشنائی کے دعوے دار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اگر نگراں موضوع سے متعلق ساری باتیں جانتا ہے تو پھر تحقیق کرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ موضوع کی اہمیت سے ضرور واقف رہتا ہے۔ اسی لیے اسکالر کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ وہ کام آگے بڑھائے۔ اس دوران دونوں ہی ایسے حقائق سے دوچار ہوتے ہیں جو پہلے سے انھیں معلوم نہیں تھے۔ اسی لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تحقیق کی کوئی منزل نہیں ہوتی اور وہ ہمیشہ امتحان کی منزلوں سے گزرتی ہے جس کی بنیاد تلاش و جستجو، مشاہدات، تجربات اور علوم کے افہام و تفہیم پر ہوتی ہے۔

ریسرچ حرکت ہے، تحریک ہے، فتح ہے۔ ایک نئی حقیقت کی تلاش و جستجو کی عقلی اور علمی کوشش ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ یہ عقل و خرد کی دشمن ہے یا اُسے معطل کر دیتی ہے، فکر و نظر میں انجماد پیدا کر دیتی ہے بلکہ اس کے برعکس ریسرچ کے منطقی نتائج تمام سماجی سائنس اور علم و ادب کے لیے بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ان سے علم و فن کی نئی راہیں سامنے آتی ہیں۔ نئی حقیقتیں اُبھرتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ فیصلہ کن تحقیقی کدوکاوش اور تحریکیں تحقیق کے اپنے مثبت وجود کا احساس دلاتی ہیں۔ ریسرچ علم طبیعیات میں مادہ اور توانائی کے برتاؤ اور رویہ سے وابستہ ہے۔ علم حیاتین میں زندگی کی پیدائش نشوونما اور بقا سے متعلق نئے گوشوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ میڈیکل سائنس میں ریسرچ نئے ذہنی افق کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور ہر دن ترقی کی نت نئی منزلیں طے کرتا ہے۔ موجودہ دور میں اس شعبہ میں جو ریسرچ ہو رہا ہے، خصوصیت سے امریکہ، سوویت روس، برطانیہ

اور فرانس میں وہ نہ صرف حیرت انگیز ہے بلکہ اُس نے انسانی خوشیوں میں اضافہ کیا ہے، بیماریوں پر قابو پایا ہے، امراض کی شدت اور وبائی صورت حال کی پیچیدگیوں کو ختم کیا ہے۔ اس طرح سائنس کے دوسرے شعبہ میں بھی ریسرچ کے ذریعہ انسان نے ارتقاء کے راستے طے کیے ہیں۔ وہ علم کیمیا یا خلائی انجینیرنگ ہو، ہر جگہ یہی ابتدائی نقوش تیار کرتا ہے، انسانی فکر کو مہمیز لگاتا ہے، ذہن کی گرہوں کو کھولتا ہے، عمل کی دنیا میں ہمہ ہمی پیدا کرتا ہے اور پھر یہ لامتناہی سلسلہ شب و روز جاری رہتا ہے۔ سماجی سائنس بھی اسی طرح افراد، سوسائٹی، سماج، معاشرہ، خاندان اور قوم و ملک میں انسانوں کی طبقاتی تقسیم اور اس کی کش مکش سے پیدا ہونے والی صورت حال کا جائزہ لیتا ہے، پھر اس روشنی میں نئے معاشی نظام کی بنیادیں اُستوار کرتا ہے۔ یہ معاشی نظام بہتر معاشرہ کی تخلیق کے بعد تہذیبی، اقدار کو بھی جنم دیتا ہے۔ یہ معاشرہ نیا آدمی پیدا کرتا ہے۔ جس کے تصورات ماضی سے تعلق تو رکھتے ہیں لیکن وہ انھیں تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر انھیں پرکھتا۔ اور پھر اپنی زندگی کے لیے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرتا ہے جس میں بلند ترین انسانی مفاد کی دُنیا چھپی رہتی ہے۔ جب معاشرہ بن جاتا ہے تو فنون لطیفہ کی دُنیا بھی ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ پھر انسان کی اندرونی زندگی کے مسائل اس کے دائرہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔

تحقیق جس طرح سماجی اور معاشی مسائل کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے اُسی طرح ادب، آرٹ اور انسان کی داخلی زندگی کے مسائل پر بھی غور و فکر کرتی ہے۔ تحقیق کے ذریعہ ہی روح، ذہن اور مادہ کی مختلف شکلوں تک ہماری رسائی ممکن ہوتی ہے۔ ہم محض جذبوں کے ساتھ

زندہ نہیں رہتے بلکہ ہر قدم پر دانش وری ہماری رہنمائی کرتی ہے اور یہ دانش وری ریسرچ کے دامن سے اس طرح لپٹی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو الگ نہیں کرسکتے۔ سب سے دل چسپ پہلو تحقیق کا یہ ہوتا ہے کہ وہ جہاں چند مسائل کو حل کرتی ہے اور حیرت انگیز انکشافات کا سبب بنتی ہے وہیں اہم سوالات بھی پیدا کرتی ہے اور اپنی مخصوص تکنک کے ذریعہ ان کی جستجو کرتی ہے اُن کا تجزیہ کرتی ہے اور فیصلہ صادر کرتی ہے۔ اسی لیے ریسرچ کو "YOGA" بھی کہا گیا ہے۔ بیسویں صدی میں ریسرچ ایک علمی لفظ بن گیا ہے۔ مگر یہ سمجھنا کہ اس کے ذریعہ انسان ذہنی بلندیوں کی اعلیٰ ترین سطح پر فائز ہو جاتا ہے غلط ہے اس کا تعلق اس نکتہ سے البتہ جڑا ہوا ہے کہ صحیح اور اعلیٰ ریسرچ کا معیار کیا ہے۔ کسی پست اور غیر معیاری موضوع کو درست تسلیم کرلینا اور اُس پر تحقیق کرانی نہ کرنے سے زیادہ نقصان دہ ہے۔

ریسرچ کی تعریف اور مفہوم کے متعلق مختلف اہل حضرات نے اظہار کیا ہے۔ مثلاً ARYA RAMCHANDRA, G. TIWARI اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ انگریزی لفظ RE کا مطلب FREQUENTA-TIVE AND INTENSIVE ہے۔ CONCISE OXFORD DICTIONARY میں بھی اس کا مفہوم یہی ہے۔ لہٰذا موصوف کے خیال میں تحقیق اُس تلاش و جستجو کو کہہ سکتے ہیں جو مختلف ذرائع سے حاصل کیے گئے اعداد و شمار کی چھان بین کے بعد نئی معلومات پیش کرتی ہو۔

سنسکرت زبان میں اس کے مترادف کئی الفاظ ہیں:

NIRUPANA, ANVESANA,

ANUSANDHANA

سنسکرت زبان میں ریسرچ کے مترادف الفاظ کے معنی تلاش وجستجو کے اعمال
کو تمام قوتِ ارادی کے ساتھ جاری رکھنے کا نام ہے۔ حقائق کا جائزہ اور
اُس کے اثرات بھی اس دائرہ میں شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ تحقیق
اور اسکالر کی کرید کو سکون عطا کرتی ہے۔ ریسرچ کے لیے جو اعداد و شمار
فراہم ہوتے ہیں اور جو نتائج نکلتے ہیں اُن میں ایک طرح کی آفاقی صداقت
بھی ہوتی ہے۔ اس طرح ریسرچ بھی ایک طرح کا سائنس بن جاتا ہے۔ کیوں کہ
سائنسی مطالعہ کے بعد ہی اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے لہٰذا اگر کسی نے ریسرچ
کو "حق کی تلاش" کہا ہے تو غلط نہیں ہے۔ اسکالر ہمیشہ کچھ سوچتا رہتا
ہے، جستجو کرتا ہے، حقیقتوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ انسان کا ذہن فطری اعتبار
سے خود بخود کسی حقیقت کی دریافت نہیں کرتا بلکہ سچ کی تلاش کا مسئلہ انسان
کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کے ساتھ دیانت دار رہے۔ اس دیانت
داری کے ساتھ مقصد کا خلوص اپنی جگہ پوشیدہ رہتا ہے۔ پھر ذہن سوچنے
اور عمل کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اس غور و فکر کے دوران اسکالر کی
ذہنی تربیت شروع ہو جاتی ہے۔ اس غور و فکر کا نام ریسرچ ہے، تحقیق ہے،
یہ غور و فکر ایک فرد کی بھی ہو سکتی ہے اور ایک جماعت کی بھی۔ سائنس اور
سماجی سائنس میں تحقیق کی نوعیت عام طور سے جماعتی ہوتی ہے۔ ادب اور
آرٹ میں بھی جماعتی حیثیت برقرار رہ سکتی ہے۔ لیکن عمومی طور پر ادب و آرٹ
میں تخلیق کی دنیا ایک فردِ واحد کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ حالانکہ فردِ واحد
کی نہ کہیں قید روا رکھی گئی ہے اور نہ اس کا اہتمام ضروری تصور کیا گیا۔ سائنس
میں بھی فردِ واحد اپنے ہم نشینوں کی مدد سے اگر کوئی نئی شے دریافت کر لیتا
ہے تو اُس کی کامیابی کا سہرا بھی اُسی ایک فرد کے سر ہوتا ہے۔

DR. B. G. SANDESRA کے مطابق ریسرچ سچ کی تلاش کا نام ہے جو مطالعہ و مشاہدہ، موازنہ اور تجزیہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ علم یا موضوع کے اُس شعبہ میں جہاں ریسرچ عملی تجزیہ گاہ میں نہیں کیا جا سکتا، وہاں تقابلی تنقید اور تاریخی طریقۂ کار کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ہاں اس کا استعمال جہاں تک ممکن ہو معروضی ہونا چاہئے۔

تحقیق کی چند تعریفیں ملاحظہ ہوں:

"RESEARCH MAY BE DEFINED AS A METHOD OF STUDYING PROBLEMS WHOSE SOLUTIONS ARE TO BE DERIVED PARTLY OR WHOLLY FROM FACTS"

C. C. CRAW FORD.

"RESEARCH IS SIMPLY A SYSTEMA-TIC AND REFINED TECHNIQUE THINKING SPECIALISED TOOLS, INSTRUMENTS, AND PROCEDURES IN ORDER TO OBTAIN A MERE ADEQUATE SOLUTION OF A PROBLEM THAN WOULD HE POSSIBLE UNDER ORDINARY MEANS"

(PHI DATTA KAPPA TRATERITY)

RESEARCH IN THE SENSE OF GATHERING DATA FOR THE SAKE OF GATH-ERING THEM HAS NO PLACE IN THE UNIVERSITY, RESEARCH IN THE SENSE OF DEVELOPMENT, ELABORATION, AND REFINEMENT OF PRINCIPLES, TOGETHER WITH THE COLLECTION AND USE OF EMPIRICAL MATERIAL TO AID IN THESE PROCESSES, IS ONE OF THE HIGHEST ACTIVITIES OF A UNIVERSITY,

(R. M. HUTOPIN)

SOME RESEARCHES ARE ACTUATED BY AMBITION, BUT MORE ARE DRIVEN BY THE URGE TO FIND OUT BY THE DESIRE TO SEE ORDER WHEARE AT FIRST THERE IS ONLY CONFUSION. THEIR REWARD IS NOT ONLY THE SATISFACTION OF ACCOMPLISHMENT IT IS AN AESTHETIC EXPERIENCE TO DISCOVER THE RECCURENT

RYTHMS OF NATURE, THERE IS THE JOY OF GENUINE PROGRESS THROUGH THE CREATION OF SOME THING NEW, THEY ALSO ADD TO THE INTELLECTUAL ESTATE OF ALL MANKIND"

[CARTER V. GOOD AND DOGLOS. F. SACAK]

" IT COMPRISES DEFINING AND REDEFINING PROBLEMS, FORMULATING HYPOTHESIS OR SUGGESTED SOLU-TIONS; COLLECTING, ORGANISING AND EVALUATING DATA; MAKING DEDUCTIONS AND REACHING CON-CLUSIONS AND, AT LAST CAREFULLY TESTING THE CONCLUSIONS TO DETFERMINATE WHETHER THEY FIT THE FORMULATING HYPOTHESES"

[CLIFFORD WOODY]

ریسرچ کی یہ تمام تعریفیں تھوڑے سے فرق کے ساتھ ملتی جلتی ہیں،

اور ان میں ایک عنصر مشترک ہے۔ یہ عنصر حقیقت کی تلاش کا جذبہ ہے۔
ہر ریسرچ خواہ وہ کسی موضوع کا ہو پہلے مسائل کو پیش کر دیتا ہے اور
پھر اُن کے حل کی طرف رجوع ہوتا ہے، یوں مفروضات کی عمارت
تعمیر ہوتی ہے۔ مگر ریسرچ کے لیے چند ضروری شرائط کا ہونا بھی ضروری
ہے۔ MICHAEL FOSTER ریسرچ کے لیے تین بنیادی
شرطوں کو ضروری سمجھتا ہے۔

(۱) اسکالر کی فطرت ایسی ہونی چاہئے جو موضوع کے ساتھ انصاف
کر سکے اور جس شئے کی اُسے تلاش ہے اُس کی طرف برابر توجہ
مرکوز رکھے۔

(۲) بیدار اور ہر لمحہ چوکنا رہنے والے ذہن کی ضرورت ہے۔

(۳) سائنسی تلاش کے لیے اخلاقی قوت اور جرأت رندانہ بھی لازمی
ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حق کی تلاش میں جان جوکھوں کا
سامنا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں قوتِ اظہار کی صلاحیت ہونی
چاہئے۔ FARADAY اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ:

"HE SHOULD BE A MAN WILLING TO
EVERY SUGGESSION BUT DETERMINED
TO JUDGE BY HIMSELF"

(۴) اس لیے بیانات میں FOSTER نے محتاط رویہ اختیار کرنے
کی تاکید کی ہے۔ بقول ہکسلے

THE ASSERTION THAT OUT STRIPS
THE EVIDENCE IS NOT- ONLY A

BLUNDER BUT A CRIME"

تحقیق کی قسمیں تحقیقی طریقۂ کار کے ماہرین نے اس کی بہت سی قسموں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ تمام قسمیں دراصل APPLIND RESEARCH اور PURE RESEARCH کے دائرہ میں آتی ہیں۔ خالص تحقیق اس لیے کی جاتی ہے کہ معلومات کا دائرہ وسیع ہو اور اطلاقی تحقیق نتائج کی روشنی میں اُسے پرکھتی ہے۔ خالص تحقیق اسکالر کے علم اور معلومات میں اضافہ کرکے اس کی مسرت اور خوشیوں کو بڑھاتی ہے۔ بہت سے سوالات اور موضوع سے متعلقہ گوشوں کو منظر عام پر لانے سے تقریباً ایک نئی دُنیا کی تلاش کا کام پورا ہو جاتا ہے۔ اگر اسکالر کسی حقیقت کو تاریکی سے روشنی میں لے آتا ہے تو وہ مقصد کے حصول میں کامیاب ہے۔ خواہ اُس کے نتائج سے سماجی زندگی پر کسی قسم کا اثر ہو یا نہ ہو۔ ان اثرات سے اسکالر بے نیاز رہتا ہے۔ اسکالر صرف اس قول پر یقین رکھتا ہے کہ علم سب سے بڑا زیور ہے، صداقت اعلیٰ ترین قدر ہے اور بقیہ تمام باتیں ثانوی ہیں۔

لیکن وہ محقق جو اطلاقی تحقیق APPLID RESEARCH سے وابستہ ہیں، صرف معلومات کی حصولیابی تک اپنے کو محدود نہیں رکھتے بلکہ وہ نتائج کو عملی شکل میں دیکھنے کے متمنی رہتے ہیں۔ اس طرح کا اسکالر ایک مسئلہ کو سامنے رکھے گا تاکہ اُسے حل کرنے کے لیے ضروری اقدامات اُٹھائے جائیں۔ اس لیے وہ پہلے سے بتائے گئے اور بنائے گئے

اصول وضابط کی حدود میں رہ کر کام کرتا ہے۔ مثلاً ماہر سماجیات بہت
سے مسائل پر غور وخوض کرتا ہے۔ وہ ماہر سماجیات جو خالص تحقیق کی
طرف مائل ہے مسائل کی نوعیت کا جائزہ لیتا ہے "کیوں اور کیوں کر"
تک اُس کی تحقیق کی دُنیا محدود ہوتی ہے۔ لیکن اطلاقی تحقیق سے وابستہ
افراد مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ بھی انھیں اعداد و
شمار کی روشنی میں کام کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک مسائل کے
حل کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ لیکن دوسرا تبدیلی کا تصور ذہن میں رکھتا ہے
لیکن اس فرق کے باوجود ان دونوں کی دُنیا ایک ہو جاتی ہے۔

OPPENHEIMER نے اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

" THE GREAT TESTIMONY OF HISTORY SHOWS HOW OFTEN IN FACT THE DEVE-LOPMENT OF SCIENCE HAS EMERGED IN RESPONSE TO TECHNICAL OR EVEN ECONOMIC NEEDS, AND HOW IN THE ECONOMY OF SOCIAL EFFORTS, SCIENCE, EVEN THE MOST ABSTRACT AND RECONDITE KIND, PAYS FOR ITSELF AGAIN AND AGAIN IN PROVCIDING THE BASIS FOR RADICALLY NEW TECH-NICAL DEVELOPMENTS "

[GREAT ESSAYS IN SCIENCE]

اطلاقی اور خالص سائنس کے حق میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں۔ HUXLEY اطلاقی سائنس اور تحقیق کو پسند نہیں کرتا۔ وہ خالص سائنس کی ثنا خوانی کرتا ہے۔ اس طرح فرانسس بیکن بھی خالص سائنس اور تحقیق کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان ناقابل عبور فاصلہ قائم کرنا اسکالر کے لیے مناسب نہیں۔

STEPHEN COVEY نے تحقیق کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے اور اسے بنیادی اور عملی تحقیق کا نام دیا ہے۔ عملی تحقیق کو وہ ACTION RESEARCH بھی کہتا ہے۔ بنیادی تحقیق اشیاء کی ماہیت سے متعلق ہوتی ہے وہ نظریاتی اصولوں سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ کسی نظام کے فکری پہلوؤں، اصولوں اور ضابطوں سے اس کا رشتہ خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس نظام کے مختلف شعبوں میں ایک دوسرے کا رشتہ کتنا مربوط ہے، وہ بھی اس کے دائرہ عمل میں آتا ہے۔ لیکن عملی تحقیق کی دنیا قدرے محدود ہے۔ اس سے فوری مسائل کے حل تو مل جاتے ہیں لیکن اس کا اطلاق مختلف جگہوں پر نہیں ہو سکتا۔ تحقیق کی یہ قسمیں بس ختم نہیں ہوتیں بلکہ اسے حسب ذیل خانوں میں بھی رکھ سکتے ہیں۔

ایک تحقیق وہ ہوتی ہے جو مسائل کے حل کی خاطر کام میں لائی جاتی ہے۔
دوسری تحقیق سے نظریات کی استواری اور تعمیر میں مدد ملتی ہے۔
اور تیسری نظریات کی جانچ اور تجزیہ سے متعلق ہوتی ہے۔ انھیں

PROBLEM SOLVING RESEARCH
THEORY DEVELOPING RESEARCH
THEORY TESTING RESEARCH

کے نام دیے گئے ہیں۔

ان کے نام سے ہی ان کی نوعیت معلوم ہو جاتی ہے۔ اُن کے مقاصد کا علم ہو جاتا ہے۔ یہ عملی تحقیق سے ملتی جلتی قسم ہے۔ البتہ اس میں وسعت زیادہ ہوتی ہے۔ مسائل جو تحقیق طلب ہوتے ہیں محدود نہیں رہتے نتیجۃً اس کی (پروسسنگ) تنظیم و ترتیب سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس واقفیت کے دوران نظریات جنم لیتے ہیں اور پھر ان کی پرکھ اور جانچ کی منزل بھی آجاتی ہے اس طرح تحقیق کی یہ تینوں قسمیں الگ ہوتی ہوئی بھی ایک دوسرے سے بے حد قریب ہیں۔

عام طور سے مفروضات کو تحقیق صحیح ثابت کرتی ہے یا اس کی تردید کرتی ہے۔ پہلی صورت میں اُس کی بنیاد پر نیا نظریہ سامنے آتا ہے اور پھر کئی نظریات پیدا ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسکالر کی مشکل آسان ہو جاتی ہے اور وہ اپنی منزل کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

تحقیق کی ان اقسام کے علاوہ WHITNEY نے چند اور قسمیں بھی بتائی ہیں۔ ان کی تفصیل ملاحظہ ہو:۔

1. DESCRIPTIVE RESEARCH
2. HISTORICAL RESEARCH
3. EXPERIMENTAL RESEARCH
4. THE PHILOSOPHICAL TYPE OF RESEARCH
5. PROGNOSTIC TYPE OF RESEARCH
6. SOCIALOGICAL RESEARCH
7. THE CREATIVE TYPE OF RESEARCH
8. RESEARCH IN CURRICULUM MAKING

ان آٹھ قسموں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں
لہٰذا انھیں صرف چار خانوں میں رکھا گیا۔ یہ چار قسمیں اپنے اندر دوسری چار
قسموں کی خصوصیتوں کو سمیٹ لیتی ہیں۔

HISTORICAL RESEARCH

DESCRIPTIVE RESEARCH

EXPERIMENTAL RESEARCH

CLINICAL OR DIAGNOSTIC RESEARCH

تاریخی تحقیق میں تاریخی دستاویز، آثار قدیمہ اور ماضی میں برگزیدہ شخصیتوں
کے کارناموں اور فلسفوں کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ وضاحتی تحقیق کا دائرہ
بہت وسیع ہوتا ہے اس میں سروے اور تحقیقات کی دوسری قسمیں شامل ہیں۔
اس میں سروے کا طریقہ کار بہت مدد دیتا ہے۔ تجرباتی تحقیق میں افتراقات
VARIABLES کا مطالعہ ہوتا ہے۔ اس کے اثرات کا جائزہ بھی لیا جاتا
ہے اور تجزیہ کے پیچیدہ ترین طریقوں سے تحقیق کی مشکل منزلیں حل کی جاتی ہیں۔
(CLINICAL) کلینکی تحقیق کیس اسٹڈی کو پیش نظر رکھتی ہے۔ اس میں
تھوڑے بہت (SAMPLES) نمونے بھی استعمال ہوتے ہیں۔

تحقیق کی ایک اور اہم قسم موضوع کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اس سلسلہ
میں ادبی تحقیق آتی ہے۔ قدیم ادب کا وہ سرمایہ جسے کسی وجہ سے عرصہ تک
نظر انداز کیا جاتا رہا ادبی تحقیق کی اہم بنیاد ہے۔ کلاسکی زبان و ادب کا
جدید حالات کی روشنی میں از سرِ نو جائزہ بھی اسی ذیل میں ہے۔ یہاں تدوین
ادبی تحقیق کی رہنمائی کرتی ہے۔ تدوین کے سلسلہ میں اصل مسئلہ متن کی شناخت
اور فیصلہ کا ہے۔ مثال کے لیے مہابھارت یا امیر خسرو کے کلام سے الحاقی حصہ کو

الگ کرنا، یا میر تقی میرؔ، سوداؔ اور دوسرے شعرائے کرام کے دیوان سے الحاقی اشعار کی شناخت کرنی ادبی تحقیق کے دائرہ میں شامل ہے۔ یہاں صرف شعر فہمی کی صلاحیت کافی نہیں ہوتی بلکہ سائنسی DOCUMENTATION کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ادبی تحقیق جو تاریخی اور سماجی تناظر میں کسی فیصلہ پر پہنچتی ہے غلط اور غیر اہم نہیں کہی جا سکتی۔ کیوں کہ یہاں حقائق کے تجزیہ کے لیے منطق کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس طرح ادبی تنقید کے فلسفیانہ اور فکری پہلوؤں پر بھی تحقیق کی جا سکتی ہے یا جمالیات کے موضوع پر تحقیق کی جانے والی تحقیق بھی ادب کے دائرہ میں آتی ہے۔

اسکالر کے مسائل

سائنسی موضوعات میں ریسرچ کے مسائل سماجی سائنس اور ادب کی طرح نہیں ہیں۔ یہاں ریسرچ قاعدہ سے مکمل ہوتا ہے، طریقۂ کار کی سختی سے پیروی کی جاتی ہے لیکن دوسرے علوم میں معیار اور طریقۂ کار لچک دار ہے۔ خاص طور پر ایم اے کے مقالوں میں جہاں طالب علموں کو تحقیق کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ لچک زیادہ نظر آتی ہے۔ چنانچہ تجربوں کی کمی کے باعث بے حد دشواری ہوتی ہے اور بہت سے طالب علم مشکل اور ناممکن سمجھ کر امتحان کے قبل چھوڑ دیتے ہیں۔

ریسرچ اسکالر کے مسائل خاص کر اردو دنیا میں بنیادی حیثیت کے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر ان کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں۔ (ابھی حال میں M. PHIL کے کلاسز بعض جامعات میں شروع ہوئے ہیں)۔ دوئم تحقیق کے طریقۂ کار پر کوئی اچھی معلوماتی اور مفید کتاب

اُردو میں اب تک نہیں لکھی گئی۔ حالانکہ ملک جید محققوں سے خالی نہیں۔ ہندوستان میں اُردو کے دانش وروں نے بھی اس کی طرف دھیان نہیں دیا اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ PH.D اور DISSERTATION اور D., LITT کے مقالات دو طرح کی کمزوریوں اور خامیوں کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔

(۱) ریسرچ اسٹوڈنٹس طریقۂ کار کی لاعلمی کی وجہ سے سینکڑوں صفحات کا پلندہ تو جمع کر دیتے ہیں، لیکن نہ SYNOPSIS قاعدہ کی بنی ہوئی ہے نہ موضوع کا مناسب انتخاب ہوتا ہے۔

(۲) نگراں خود طریقۂ کار سے ناواقف ہے اُنھیں نہیں معلوم کہ TERM PAPER، ASSESSMENT اور پی ایچ، ڈی یا ڈی لِٹ کے مقالوں میں کیا فرق ہے۔ اسے اس کا بھی احساس نہیں کہ ادبی تحقیق سماجی علوم کی تحقیق سے بہت استفادہ کر سکتی ہے اور یہ ضروری بھی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اُردو کے اساتذہ کرام کی بڑی تعداد ایسی ہے جو مولویت اور خانقاہی تربیت کے زیر اثر جدید علوم اور سائنس سے استفادہ کو اب بھی گناہ کے مترادف تصور کرتے ہیں۔ اس چشم پوشی کی وجہ سے طالب علموں کو ڈگری تو مل جاتی ہے لیکن تھیسس معیار کی ادنیٰ سطح پر بھی پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ حسب ذیل امور کی طرف ارباب حل وعقد دھیان دیں۔

(I) DISSERTATION کو لازمی موضوع بنا دیا جائے۔

(II) تحقیق کے طریقِ کار کا نظریاتی سبق نصاب میں شامل کر دیا جائے۔

(III) سماجی علوم کے ذریعہ ادبیات کی تعلیم کا نظم کیا جائے۔

(IV) عصری ادب (بین الاقوامی اور قومی) کا مطالعہ نصاب کا ایک ناگزیر حصہ ہو جائے۔

(V) دوسری زبانوں کے ادب میں تحقیق کی رفتار اور اس کے سرمایہ سے واقفیت کی کوئی عملی صورت نکالی جائے۔

(VI) شعبہ کے ریسرچ جرنل معلوماتی مضامین سے پُر ہوں جس میں ابتدائی اور اعلیٰ سطح کی تحقیقی کاوشوں کا جائزہ بھی لیا جائے۔

(VII) اساتذۂ کرام کے لیے ریسرچ کے طریقۂ کار کا ایک ریفریشر کورس بنایا جائے اور سال میں ایک بار اس کی تربیت دی جائے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اسکالر اور نگراں ریسرچ کے ابتدائی مسائل سے واقف ہو جائیں گے اور وہ طریقۂ کار کی روشنی میں تحقیق کی دشوار گزار راہوں کو طے کرنا سیکھ جائیں گے۔

طالب علموں اور اسکالر کے دوسرے اہم مسائل کی نوعیت معاشی بھی ہے۔ تحقیق کی دشوار منزلوں کو طے کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دانش گاہوں کے ذریعہ وسیع پیمانہ پر مالی اعانت کا منصوبہ بنایا جائے اور اسکالر کو کم از کم بنیادی ضرورتوں کی کفالت کے لیے مالی امداد فراہم کی جائے۔ اگر اس بات کا اندیشہ ہے کہ اخراجات کی رقم صحیح مد میں خرچ نہیں کی جائے گی تو کم از کم لائبریری اور سفر کے اخراجات کے لیے پاس کا نظم کرنا بہت معمولی بات ہے۔ جب تک کتابیں نہ ہوں گی تحقیق کا کام ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جامعات ہند کے علاوہ یو جی سی کی اسکالر شپ بھی ہوتی ہے۔ لیکن ان کی تعداد اُردو والوں کے لیے بہت کم ہے یہ بڑھنی چاہیے اور کتابوں کے لیے مالی گرانٹس نئے کم شعبہ سے ہر سال کتابوں اور رسالوں کی فہرست طلب کر لی جائے تاکہ رقم کا

غلط استعمال نہ ہو۔ ریسرچ اسکالر جب تحقیق کی خواہش کا اظہار کرتا ہے یا فیصلہ کرتا ہے تو سب سے پہلے اُسے نگراں کا انتخاب کرنا ہے۔

نگراں کے فرائض

(۱) نیا اسکالر تحقیق کی ابتدائی منزلوں سے ناآشنا ہوتا ہے۔ اُس کے پاس ماضی کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ خاص کر ایم۔ اے کے طلبا اور طالبات بالکل ہی کورے ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں یہ فیصلہ خود کرنا چاہیے کہ نگراں کون ہو؟ نگراں کا انتخاب کرتے وقت یہ دیکھ لینا چاہیے کہ اُس میں تحقیق سے دلچسپی ہے یا نہیں اور خود وہ تحقیق کی منزلوں سے گذرا ہے یا نہیں؟ جب اُسے تشفی ہو جائے تو تحصیل علم کے لیے اُس سے رجوع ہو سکتا ہے۔ نگراں کے فرائض نہ صرف اسکالر کے تئیں اہم ہوتے ہیں بلکہ علم و ادب کا تقاضا ہے کہ وہ ذمہ داری کے ساتھ حسب ذیل اُمور کی طرف راغب ہو، اور اُمیدوار کو موضوع کے انتخاب میں مدد دے۔ اُمیدوار کی افتادِ طبع کے مطابق مختلف موضوعات کی فہرست بنالے اور پھر خواہش کے پیش نظر موضوع کے آخری انتخاب میں مدد کرے۔ موضوع ایسا ضرور ہونا چاہیے جو نیا ہو۔ جس پر اب تک کسی نے کام نہ کیا ہو یا اگر کام ہوا ہے تو تشفی بخش نہیں اور نگراں سمجھتا ہے کہ موضوع میں کوئی نیا گوشہ، نئی فکر اور نئی راہیں نکل سکتی ہیں۔ کسی ایسے موضوع پر ریسرچ نہیں کرانا چاہیے جس پر نگراں عبور رکھتا ہے یا جس پر اُس نے خود کام کیا ہے۔ ایسی صورت میں تحقیق نہ معیاری ہوگی اور نہ اپنے مقاصد کو پورا کر سکے گی۔ جب موضوع کا احاطہ ہو چکا ہے اور کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا تو

پھر تضیع اوقات اور دردسری بیکار ہے۔

(۲) ادب میں عام طور سے تدوین یا شخصیتوں کے کارناموں پر ریسرچ کی بھرمار ہے۔ خاص کر اُردو ادب کے اساتذہ کرام اس مرض میں مبتلا ہیں۔ اس کی وجہ ان دنوں صرف یہ ہے کہ انھیں اپنی کیریئر کے لیے تحقیقی تجربہ چاہیئے۔ جب تک وہ Ph.D یا D.Litt پیش نہیں کرتے پروفیسر نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ انھیں اس کی فکر نہیں کہ ریسرچ کا موضوع فرسودہ ہو چکا ہے، قابلِ تحقیق نہیں یا شخصیتوں کے کارنامہ گراں قدر نہیں۔

مَیں اس سلسلہ میں انھیں موردِ الزام نہیں ٹھہراتا۔ یہ ہمارے تعلیمی نظام کی خرابی ہے جب تک اس میں صحت مند تبدیلی نہیں ہوگی اساتذہ کرام کے ذریعہ ناقص Ph.D. اسکالر پیش کرنے کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ جو حضرات ان منازل سے گذر جاتے ہیں وہ اپنے احباب کو موضوع بنا لیتے ہیں، خاندان میں کوئی گھٹیا درجہ کا بھی شاعر پیدا ہوا ہو، اُس کے دیوان کی تدوین کرا دیتے ہیں۔ تاکہ اقربا پروری کے ساتھ ساتھ دوسرے مفادات بھی حاصل ہوتے رہیں۔ ان سے اس وقت اجتناب کی سخت ضرورت ہے۔

نظریاتی عصبیت کی وجہ سے بہت سے حضرات اپنے پیرو مرشد کو موضوعِ تحقیق بنا لیتے ہیں۔ مَیں اس کی مثالیں دے کر معتوب ہونا نہیں چاہتا۔ بہرحال یہ حالات ہیں جن کی وجہ سے موضوعات میں جدّت، نیاپن اور فکری تنوع تحقیق کی دسترس سے محروم ہو جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ موضوع کے انتخاب کے وقت دو تین باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔

(۱) ادب کا مطالعہ سماجی علوم کے نقطۂ نظر سے کرنا چاہیئے، اور جدید علوم کے ذریعہ ادب کا ایک ایسا رشتہ قائم کرنا چاہیئے جو آج کی اہم ضرورت ہے

مثلاً علم نفسیات نے کس حد تک ادب کو متاثر کیا ہے۔ فکشن پر اس کے اثرات کی نوعیت کیا ہے۔ اسی طرح اگر جدید شاعری موضوع تحقیق ہے تو اشعار کی CONTENT ANALYSIS کو موضوع تحقیق بنانا چاہیے۔ اگر غالب کی شاعری پیش نظر ہے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی معنویت آج کیا ہے اور شاعر کیوں سو برس بعد مقبولیت کی اعلیٰ منزلوں سے گذر رہا ہے۔ اس طرح اگر فیض ایک LEGEND بن رہے ہیں تو اُس کے اسباب کیا ہیں۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔ ان باتوں کو جاننے کے لیے خالی خولی ادب اور شاعری کا مطالعہ کافی نہیں، اس کے لیے سماجی علوم کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر تجزیہ غیر سائنسی ہوگا۔ معلومات کی دُنیا محدود ہوگی اور حقائق کی تکرار کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لہٰذا نگراں کو اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ وہ تحقیق کی ذمہ داریوں کو محسوس کرے اور موضوعات کے انتخاب کا شعور رکھے۔ ورنہ اس کی رسوائی کے سارے سامان مہیا ہو جائیں گے۔

اس طرح عصری ادب کے گراں قدر سرمایہ کا تقابلی مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔ اِن مثالوں سے میں صرف اس امر پر زور دینا چاہتا ہوں کہ نگراں ایسا موضوع چُنے جو تحقیق و تنقید کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔

(۲) موضوع کے انتخاب کے بعد نگراں کا فرض ہے کہ وہ موضوع کا جائزہ لے اور ایک SYNOPSIS بنائے۔ قاعدہ کے مطابق یہ کام اسکالر کو خود کرنا چاہیے۔ نگراں اس میں ترمیم بے شک کر سکتا ہے

لیکن ان دنوں دانش گاہوں اور اسکالروں کی جو حالت ہے اُس کے پیش نظر یہ ذمہ داری بھی نگراں کو قبول کر لینی چاہیے۔

(۳) مواد کی فراہمی اور حصول کے طریقے اس کے بعد آتے ہیں۔ نگراں کا یہ فرض ہے کہ وہ اُن تمام ذرائع سے اسکالر کو آگاہ کرے جن سے مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کتابوں کی فراہمی، لائبریری میں کتابوں کا مطالعہ، انٹرویوز، سوال نامہ کی اہمیت اُجاگر کرنا اور پھر حاصل کیے گئے مواد کی ترتیب اور تصدیق کے مرحلوں سے گزرنا بھی شامل ہے۔ حاصل کیے گئے مواد کے متعلق ماہرین موضوعات کی سند اور اُن کے تبصرے بھی ضروری ہوتے ہیں۔ اُن کے کام کا جائزہ اور ترمیم و تنسیخ شامل ہے۔

اس لیے کہا جاتا ہے کہ ریسرچ کی پہلی منزل نگراں کے انتخاب کی ہے جو منتخب موضوعات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ نگراں حسب ذیل امور میں اسکالر کی رہنمائی براہ راست کرتا ہے:۔

۱۔ موضوع کے ابتدائی خاکہ کی تعمیر و تشکیل
۲۔ کتابیات کی ترتیب
۳۔ مواد کی فراہمی
۴۔ متن کی صحت
۵۔ تنظیم و ترتیب کا فن
۶۔ دیانت داری
۷۔ تعصبات سے نجات کے ذرائع
۸۔ حوالوں کی یکجائی کے مسایل

(۴) ۹- تجزیہ

یہ سب ہو جائے تو نگراں ابتدائی ببلوگرافی کو جدید تر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ابتدا میں جو ببلوگرافی بنتی ہے وہ کام ختم ہونے کے وقت تک تشنہ اور ادھوری رہتی ہے اس لیے جب مقالہ نظرثانی کی منزل میں داخل ہو تو نئی کتابوں کی شمولیت ضروری ہو جاتی ہے۔ نئی اطلاعات محض کتابوں کے ہی ذریعہ حاصل نہیں ہوتی ہیں بلکہ رسالوں، جرنلس، سرکاری ایجنسیوں کے ذریعہ بھی ملتی ہیں۔ اس لیے ببلوگرافی کو از سر نو ترتیب دینا چاہئے۔ یہ نئی ببلوگرافی حروف تہجی کے مطابق تیار ہونی چاہئے۔

(۵) نگراں تحقیق کے دوران اپنے شک وشبہات کا اظہار گاہے بگاہے کرتا رہتا ہے اور اسکالر کی توجہ چاہتا ہے۔ تاکہ مقالہ میں صداقت کی غلطیاں نہ رہ جائیں۔ اس موڑ پر اُسے مستند حوالوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نگراں شکوک وشبہات کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ لیکن سند حاصل کرنے اور حقائق کی تلاش اسکالر کو بنانے کے طریقہ سے کرنی ہوگی۔

(۶) کام کا وقت متعین کرنا اور اسکالر سے قریبی تعلق قائم رکھنا بھی نگراں کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کی ملاقات کو مہینوں اور برسوں ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں نہ تحقیق اپنی جگہ سے آگے بڑھے گی اور نہ نگراں کو اس کے کام میں دلچسپی ہوگی۔ لہٰذا جب نگراں کسی اسکالر کو اپنی نگرانی میں لیتا ہے تو اُسے اُمیدوار کی ذمہ دارانہ شخصیت کا کچھ علم ہونا ضروری ہے ورنہ نگرانی کی فہرست طویل تر ہو جائے گی اور کام ندارد۔ لہٰذا

دونوں کے مابین قریبی تعلقات کا ہونا ضروری ہے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کام کا جائزہ برابر جاری رہے گا اور مستقبل کے لیے ہدایتیں بھی ملتی رہیں گی۔

(۷) نگراں کا آخری اہم کام یہ ہوتا ہے کہ مواد کے ڈھیر کو سلیقہ سے ترتیب دے۔ اور جب تحریر کی منزل آئے تو اسکالر کی رہنمائی کرے۔ کیونکہ اسکالر خود سے پہلی بار یہ نہیں کر سکتا۔ وہ کبھی کبھی مواد کی فراہمی میں اتنا مصروف رہتا ہے کہ یہ بات اُس کے دماغ سے نکل جاتی ہے کہ تحقیق کے مواد کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ لہٰذا مواد کی فراہمی کے ساتھ ہی ساتھ تحریر کی ابتدائی صورتیں بھی سامنے آنے لگتی ہیں، اس وقت نگراں کی بروقت رہنمائی اس کے لیے بے حد کام کی ہوتی ہے۔ اس عمل سے ایک خاص مدت میں مقالہ تیار ہو جاتا ہے۔ نگراں کے ساتھ ساتھ اسکالر کو بھی حق کی تلاش میں صبر آزما منزلیں طے کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ بسا اوقات مایوسی اور دشواری تحقیق کے تدریجی ارتقا میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ایسے لمحوں میں اُسے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے یہ اشعار یاد رکھنے چاہئیں۔

IN ORDER TO ARRIVE AT THAT
WHICH THOU KNOW EST NOT,
THOU MUST GO BY A WAY THAT THOU
KNOW EST NOT,
IN ORDER TO ARRIVE AT THAT
WHICH THOU POSSESSEST NOT

THOU MUST GO BY A WAY THAT
THOU POSSESSEST NOT,
IN ORDER TO ARRIVE AT THAT
WHICH THOU ART NOT,
THOU MUST GO THROUGH THAT
WHICH THOU ART NOT.

نگراں کو یہ ہدایت بھی دینی چاہیے کہ حقایق معتبر ہوں اور اسکالر انھیں پیش کرتے وقت احساس برتری کے نشہ میں ڈوبا ہوا نہ ہو۔ غیر ضروری ذہانت کا مظاہرہ بھی نہیں ہونا چاہیے بلکہ بیان میں اختصار اور کام کی باتوں تک اپنی انا کو محدود رکھنا چاہیے۔ ہاں شک و شبہ کے مقامات کی وضاحت گائڈ کا اولین فرض ہے ورنہ مقالہ کمزور ہو جائے گا۔ نمونہ کے لیے اچھے مقالوں کا مطالعہ ضروری ہے جیسے EMPSON'S SEVEN TYPES OF AMBIGUITY۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کسی مقالہ کی نقل کر دی جائے۔ ہر موضوع کے اپنے مسائل ہوتے ہیں، اپنی نوعیتیں ہوتی ہیں۔ چونکہ اُمیدوار کو موضوع کی وسعت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا اس لیے نگراں کے مفید مشوروں کے بغیر اس کی تحقیق غیر معیاری اور غیر مستند ہوگی۔ البتہ اس کی رہنمائی کر دی جائے تو وہ یہ دشوار گذار سفر خود اکیلا طے کر سکتا ہے۔ اگر اسکالر لسانیاتی موضوع پر تحقیق کر رہا ہے تو اُس کی دشواریاں بڑھ جاتی ہیں، جہاں

الفاظ کا شاعرانہ استعمال محل نظر ہے، وہاں باریک بینی ذوق صحیح کے باوجود بغیر نگراں کی مدد کے وہ کچھ نہیں لکھ سکتا۔

ان دنوں لسانیات کی مختلف شاخیں ہوگئی ہیں۔ ان کی مدد سے اشعار کے معنی میں بڑی تبدیلی آگئی ہے اس کا جائزہ بیانیہ لسانیات میں کیا جاتا ہے، یہ ایک تکنیکی کام ہے۔ اس مہم کو طے کرنے کے لیے اچھے نگراں کی ہدایت بے حد لازمی ہے۔

باب دوم

موضوع کا انتخاب

تحقیق کے مدارج میں سب سے اہم منزل موضوع کے انتخاب کی ہے۔ اگر اسکالر نے اپنی صلاحیت، مذاق اور اپنی پسند کی روشنی میں موضوع کا انتخاب نہیں کیا تو اس کی تحقیق کبھی مکمل نہیں ہو گی اور اگر مکمل ہو بھی گئی تو اُس سے مفید نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ دانش گاہوں میں تحقیقی صورتِ حال اسی لیے ابتر ہے۔ جو اسکالر شعر، موزوں نہیں پڑھ سکتا وہ عموماً شعرائے کرام کے دیوان کی تدوین میں لگ جاتا ہے۔ اس طرح جسے علم لسانیات سے کوئی دل چسپی نہیں وہ لسانیات کو موضوع تحقیق بنا لیتا ہے۔ اس لیے تحقیق کا سب سے ابتدائی مرحلہ موضوع کے انتخاب کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

موضوع کتنا ہی فرسودہ کیوں نہ ہو اپنے اندر نئے گوشوں کو بے نقاب کرنے کی بے پناہ وسعتیں رکھتا ہے۔ قدیم داستانوں، کلاسکی کہانیوں، اساطیری قصوں کو محض غیر حقیقی کہہ کر نظر انداز کرنا دانش مندی نہیں۔ ان میں سینکڑوں برسوں کی تہذیبی علامتیں پوشیدہ ہیں۔ اس طرح عوامی شاعری، لوک گیت، پہیلی، آج بھی ادبی تحقیق کے دل چسپ موضوعات ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور دیکھنا چاہئے کہ جن پہلوؤں پر تحقیق کی جا چکی ہے اور اُس سے خاطر خواہ نتائج کے برآمد ہونے کی اُمید ہے یا نہیں۔ اگر مفروضات کی تردید کے قرائن ملتے ہیں تو گریز کرنا چاہئے۔ لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں کہ جن موضوعات پر تحقیقی سرمایہ کافی جمع ہو چکا ہے

وہ مزید تحقیق کا بوجھ برداشت نہیں کر سکے۔

اسکالر کے ذہن میں بیک وقت متفرق موضوعات پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک فطری امر ہے۔ انسانی ذہن سینکڑوں تصورات کی پرورش کرتا رہتا ہے۔ اس لیے خیالات کی یورش پر گرفت رکھنا ضروری ہے۔ اُسے اپنی علمی استعداد، ذہنی رجحان کو برابر پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کی وجہ سے وہ پراگندگیٔ ذہن کا شکار نہ بن پائے گا اور ایک بار موضوع کے انتخاب کا فیصلہ عمل میں آگیا تو تحقیق کی پہلی اینٹ صحیح جگہ پر رکھ دی جائے گی۔ موضوع کی مناسبت اور اسکالر کے مزاج کے مطابق نگراں کا وجود بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اُسے بھی موضوع سے اتنی ہی دل چسپی رہنی چاہیے جتنی اسکالر کو ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے تاکہ وہ مواد کی حصول یابی اور اعداد و شمار کی یک جائی اور تجزیہ کے دوران رہنمائی کے فرائض انجام دے سکے۔

موضوع چُنتے وقت یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ دائرہ اتنا وسیع نہ ہو کہ وقت معینہ پر کام مکمل نہ ہو پائے۔ اس لیے اختصار اور وقت کی محدودیت بھی موضوع کے تعین میں ایک اہم عنصر بن جاتی ہے۔ اگر پاکستانی ادب پر تحقیق کی جارہی ہے تو یہ بات پہلے سے سوچ لینی چاہیے کہ پاکستان کا ادب بہ آسانی دستیاب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر جواب نفی میں ہے اور اس کے امکانات ہیں کہ پاکستانی ادبی سرمایہ تک اسکالر کی رسائی ممکن نہیں ہو سکتی تو یہ موضوع فوراً ترک کر دینا چاہیے۔ اگر مواد کی حصول یابی کے ذرائع دسترس میں نہ ہوں گے تو تحقیق آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس طرح اگر تحقیق کے لیے خاص آلات، لائبریری اور کتابوں کی ضرورت ہے یا تجربہ گاہوں کی، اور وہ اسکالر کی دست رس سے باہر ہوں تو بھی موضوع کے انتخاب پر

نظر ثانی کی ضرورت ہوگی۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ یہ مطالعہ سود مند ہے یا نہیں اور اس کے لیے بنیادی اور ثانوی ذرایع تک آسانی سے محقق رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

اخراجات بھی تحقیق کے لیے ضروری ہیں۔ موضوع کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو روپیہ کے بغیر اسکالر کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے ابتدا ہی میں اندازہ کر لینا چاہیے کہ کون سا موضوع کم سے کم اخراجات میں پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔

ریسرچ یونیورس اور سی نا پسِس

مشہور امریکی فلاسفر CHARLES PEIRCE نے علم اور معلومات حاصل کرنے کے چار اہم طریقوں سے بحث کی ہے۔ اول METHOD TENACITY ہے۔ یعنی آدمی صداقت کے تئیں کڑا رویہ اختیار کرتا ہے۔ صداقتوں کی دنیا وہ ہوتی ہے جس کو ایک آدمی اپنے تئیں سچ سمجھتا ہے اور وہ تجربات کی روشنی میں انھیں برابر صادق پاتا ہے ــــ دوسرا METHOD OF AUTHORITY ہے۔ اس کا تعلق تسلیم شدہ عقائد سے گہرا ہے۔ مذہبی کتابوں میں جتنی باتیں لکھی ہیں وہ اُس مذہب کے ماننے والے بغیر کسی چوں چرا کے سچ سمجھتے ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعہ زندگی کے بہت سے سربستہ راز وا ہوتے ہیں اور انھیں پہلی نظر میں غیر اہم سمجھنا غلطی ہے۔ METHOD OF INTUTION تیسرا طریقہ ہے۔ اسے A PRIORI METHOD بھی کہتے ہیں۔ یہاں ایک حد تک عقل و دانش کا گزر ہے۔ یہاں آدمی تبادلہ خیالات کے ذریعہ سچ کی تلاش کرتا ہے۔

علم حاصل کرنے کا آخری طریقہ METHOD OF SCIENCE

ہے ___

تحقیق کی ابتدائی منزلوں میں جب موضوع کا انتخاب ہو جاتا ہے اور SYNOPSIS بنانے کا وقت آتا ہے تو ان چار طریقوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ بظاہر امریکی فلاسفر نے ان طریقوں کو علم کے سرچشموں سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن تحقیق جو خود بھی حقیقت کی تلاش کا فن ہے ان سے فیض حاصل کر سکتی ہے۔ موضوع کے تعیُن کے بعد اس کی وسعت، دائرہ اور پھیلاؤ کا تعلق اس صداقت سے بھی ہے جس کو آدمی سچ سمجھتا ہے اُن عقاید سے بھی گہرا رشتہ ہوتا ہے جو مذہبی صحیفوں کی دین ہیں۔ پھر علم و دانش کے تبادلے سے گزر کر جب تحقیق نئی مرحلہ میں داخل ہوتی ہے تو یہاں سائنسی طریقہ کار اُس کی رہبری کے لیے تیار نظر آتی ہے۔ تحقیق اپنے کنواس کو جب تک واضح نہیں کرتی موضوع کے ساتھ نباہ ممکن نہیں۔ اگر کنواس واضح ہو گیا تو جو خاکہ بنایا جائے گا وہ خوش اسلوبی سے اُن سارے نکات کو سمیٹ لے گا جو موضوع اور "یونی ورس" کی وجہ سے تحقیق کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔

موضوع اور یونی ورس کے انتخاب اور وضاحت کے بعد کی منزل SYNOPSIS کی ہے۔ اس کی صورت اس طرح ہو گی۔

(۱) دیباچہ ۔ اس میں موضوع کا تعارف، دائرہ، پس منظر، اور مقصد شامل ہے۔ گرچہ یہ مقالہ کا پہلا باب ہوتا ہے لیکن اسے سب سے آخر میں لکھا جاتا ہے۔ جب تحقیق مکمل ہو جاتی ہے تو بہت سے نئے گوشے رونما ہوتے ہیں۔ نئی نئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ اس لیے اس کی گنجائش رکھی جاتی ہے کہ وہ سب دیباچہ میں شامل کی جا سکیں۔

بہت سے افراد دیباچہ کی جگہ تعارف لکھتے ہیں۔ تعارف لکھتے وقت دو اہم باتیں ذہن میں ضرور رکھنی چاہیئے۔ موضوع کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اگر تعارف ہی خشک، بھونڈا، مضحکہ خیز اور غیر منطقی ہے، تو مقالہ کا قاری خواہ وہ ممتحن ہی کیوں نہ ہو دلچسپی سے نہیں پڑھے گا۔ ابتدائی چند صفحات سے اندازہ لگ جاتا ہے کہ مقالہ کیسا ہے۔ اس لیے تعارف جو تھیسس کا پہلا تعارفی باب ہوتا ہے، خاصا اہم ہوتا ہے۔ پہلی چیز جو پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے وہ اسلوب ہے۔ اسلوب منفرد، سادہ اور دل پذیر ہے تو موضوع کتنا ہی خشک کیوں نہ ہو اپنے قارئین کا ایک وسیع حلقہ بنا لے گا۔ ایک اہم خاکہ کے لیے ضروری ہے کہ اُس میں حسب ذیل باتوں کی طرف اسکالر اور نگراں نے توجہ دی ہو۔

(ا) موضوع سے متعلق مسائل کی تشریح کر دی گئی ہو۔

(اا) مطالعہ کی ضرورت اور مقصد کی وضاحت کی محتاج نہ ہو۔

موضوع اور مسائل کی اہمیت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہو جس میں داخلی جذبات و احساسات کی جگہ سائنسی نقطۂ نظر کی زیادہ جگہ ہو۔

اگر ماضی میں کوئی تحقیق کی گئی ہے تو خاکہ میں اس طرح اُس کا ذکر ہونا چاہیے جس سے پتہ چل سکے کہ یہ نئی تحقیق پچھلی تحقیق سے آگے کی طرف ایک اہم منزل ہے پھر اس کی ضرورت بھی بیان کرنی چاہیے۔ تاکہ مقاصد پر اچھی طرح روشنی پڑ سکے۔

تحقیق کے طریقہ کار کا ذکر بھی خاکہ میں ضرور ہونا چاہیے۔ سچ پوچھیے تو خاکہ ریسرچ ڈیزائن کی پہلی منزل ہوتا ہے۔

خاکہ میں ابواب کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیے جس سے ربط و تسلسل کا

پتہ چل سکے۔ اس تقسیم کی بنیاد اگر منطقی غور وفکر پر نہ ہو، تو اسکالر مقالہ کی تحریری منزل میں بہت سی دشواریوں میں پھنس جائے گا۔ ان تمام کمزوریوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اسکالر خاکہ کو آخری شکل دینے کے پہلے کئی بار نگراں کی مدد سے نظر ثانی کرے۔

خاکہ میں کتابیات کی شمولیت ناگزیر ہے۔ یہ پوری تھیسس کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ اسے کسی قیمت پر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ضمیمہ بھی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ضمیمہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ ضمیمہ کوئی بے کار شئے نہیں ہے یا فیشن کے طور پر اس کا استعمال نہیں ہوتا۔ خاکہ میں اس کی نشاندہی ہونی چاہئے۔ اُردو میں عام طور سے اشاریہ نہیں ہوتا۔ اسے نظرانداز کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک اچھی تھیسس میں یہ شامل رہتا ہے۔

خاکہ کا آخری باب اختتامیہ ہوتا ہے۔ اس میں مقالہ نگار کوئی باتیں شامل کرنی ہوتی ہیں۔ ابواب کی روشنی میں وہ تمام FINDING کو یکجا کرلیتا ہے۔ اپنے مقاصد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ مفروضات کی تردید یا تصدیق کا جائزہ لیتا ہے۔ طریقہ کار کی روشنی میں جو نتائج سامنے آتے ہیں اُن سبھوں کو اس آخری باب میں رقم کرتا ہے۔ وہ اُن مسائل کا بھی ذکر کر سکتا ہے، جو تحقیق کے دوران وارد ہوتے اور جن پر نئے سرے سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ اچھا مقالہ وہ ہوتا ہے جس کے ابتدائی اور اختتامیہ ابواب قاری کے دلوں میں پہلے جستجو اور کرید پیدا کرے اور جب وہ آخری منزلوں سے گزر رہا ہو تو اُسے یک گونہ طمانیت قلب ہو جائے۔

تحقیق کا ڈیزائن

تحقیق کے سلسلہ میں ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ تحقیق کی مختلف منزلوں اور مرحلوں کو کس طرح قابو میں رکھا جائے۔ یعنی ریسرچ کی دُنیا گرفت میں رہے۔ اگر ذہن انتشار میں مبتلا ہو جائے اور گرفت میں نہ رہے تو اسکالر ریسرچ کی حدوں سے کہاں تجاوز کر رہا ہے اُسے خبر بھی نہ ہوگی۔ اس لیے ریسرچ کے ڈیزائن کا عمل ضروری سمجھا گیا۔

ایک آرکٹکٹ یا انجینیر جب کسی مکان کا نقشہ بناتا ہے تو وہ اپنے فیصلہ پر متعدد بار غور کرتا ہے۔ اُسے مکان بنانے والے کی ضرورت، اس کے مقاصد کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ مکان میں کتنے کمرے ہوں، عمارت سازی کا کون کون سامان استعمال کیا جائے۔ دروازوں کی تعداد، دیواروں کے رنگوں تک ہر جگہ آرکٹکٹ کی جادوگری نظر آتی ہے اور یہ سب جادوگری مکان بننے کے پہلے اس کے ذہن، نقشہ پر بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے تاکہ مکان بننے کے پہلے وہ اپنے ذہن میں اچھی طرح اُس کو محفوظ کرلے۔ چنانچہ وہ اپنے تخیل کی دُنیا میں عمارت کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے مکان بننے کے بعد وہ نظر آتی ہے۔ اگر وہ اس پر عمل نہ کرے تو صاحب مکان کی ضرورتوں کو عملی شکل کبھی نہ دے پائے گا۔ اس نقشہ کی مدد سے وہ اُن دشواریوں کو محسوس کرلیتا ہے جو مکان بننے کے بعد اچانک نظر آجانے والی ہیں۔ اس لیے پہلے سے ہی وہ تراش خراش کے ذریعہ کتنے اقدامات اُٹھا سکتا ہے۔ مکان بنانے والے کو کسی بات کی تکلیف نہ ہو اور اس کے تمام مقاصد پورے ہو جائیں۔ یہ اچھے آرکٹکٹ کا اہم مطمح نظر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی زمین اور روپیوں کی کفایت بھی ذہن میں آتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں عام طور سے عمارت سازی چاہے

گاؤں کی ہو یا شہروں کی اس طرف دھیان نہیں دیا جاتا۔ نتیجہ برابر دیکھنے میں آتا ہے کہ نہایت بھونڈے، مضحکہ خیز مکانات تعمیر ہوتے ہیں اور اس تعمیر سازی میں زمین اور اخراجات کی بھی زیادتی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن ماہرین کی مدد سے نہ صرف روپیہ اور زمین کی بچت ہو جاتی ہے بلکہ وقت اور محنت کی بھی بچت ہوتی ہے جو اس مصروف ترین زمانہ میں بے حد گراں ہیں۔

لہٰذا ہوشیار اور باشعور افراد ایک اچھے آرکٹکٹ سے نقشہ اپنی ضرورت کے پیش نظر بنواتے ہیں۔ اب یہ آرکٹکٹ ڈیزائن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ڈیزائننگ دراصل ایک طرح کی منصوبہ بندی ہے بلکہ سچ پوچھیے تو ڈیزائننگ فیصلہ صادر کرنے کے قاعدہ کو کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا ایسا قاعدہ اور ضابطہ ہے جس کے ذریعہ سوچی سمجھی اسکیم کو جب اس کی عملی شکل اختیار کرنے والی ہو قابو میں رکھا جا سکے۔

ریسرچ پر یہ مثال اچھی طرح چسپاں ہوتی ہے۔ سوال ناموں، سروے یا فیلڈ اسٹڈی کے پہلے ہمیں اچھی طرح اس پر غور کرنا ہے کہ ان سے پیدا شدہ مسائل کس طرح حل کیے جائیں۔ اسکالر کے دماغ میں بہت ممکن ہے بے شمار خیالات اور ڈیزائن آتے ہوں۔ لیکن اُن تمام باتوں کو یاد رکھنا کسی بھی ریسرچ اسکالر کے لیے ممکن نہیں اس لیے وہ علامتوں کو اخذ کرتا ہے یا بعض تصور کی جگہ ایک نشان بنا لیتا ہے۔ اس کی مدد سے وہ ریسرچ کی باتوں کو ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے اور انھیں نشانات اور علامتوں کی موجودگی میں وہ پورے ریسرچ کا نقشہ مکمل طور پر دیکھ سکتا ہے۔ کہاں خامی رہ گئی، کہاں غیر ضروری چیزیں شامل ہو گئیں۔ یہ سب اُسی وقت اُس کی نگاہوں کے سامنے اُبھر سکتی ہیں جب وہ علامتوں کے ذریعہ دائرۂ عمل کی دنیا سے واقف ہو۔

ریسرچ ڈیزائن کا تعلق تحقیق کی مندرجہ ذیل باتوں سے ہے:۔

(۱) تحقیقی مطالعہ کے موضوع کی نوعیت کیا ہے اور اُس سلسلہ میں کس طرح کی معلومات اور اعداد و شمار کی تلاش ہے۔؟

(۲) تحقیق کیوں کی جا رہی ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟

(۳) معلومات کا ذخیرہ کہاں ملے گا۔؟

(۴) کن کن علاقوں میں مطالعہ ضروری ہوگا۔؟

(۵) تحقیق کے لیے مطالعہ میں کتنی مدّت لگے گی۔؟

(۶) مواد کا کتنا ذخیرہ درکار ہے؟

(۷) ڈاٹا جمع کرنے کے طریقے کیا ہوں گے؟

(۸) ڈاٹا کو کس طرح تنقید، تجزیہ کی منزلوں سے گذارنا ہے۔

(۹) ان باتوں کو کس طرح بروئے کار لایا جائے تاکہ کم سے کم وقت اور روپیوں میں تحقیق مکمل ہو جائے۔ یہ ضروری ہے اس لیے

COOK STATE اور DEUTSH ، JAHODA ، SELLTIZ نے ریسرچ ڈیزائن کو ڈاٹا جمع کرنے کے فیصلوں سے تعبیر کیا ہے جس کی وجہ سے ہر امر میں کفایت شعاری کا عمل ممکن ہو جاتا ہے۔ ڈاٹا کس طرح جمع کیا جائے SAMPLES کا انتخاب، جمع کیے گئے ڈاٹا کی یکجائی کا مسئلہ پھر اُس کا تجزیہ اس طرح ہو کہ تحقیق کے مقاصد اور اُس کی معنویت باقی رہے' ریسرچ ڈیزائن میں شامل ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے ڈیزائن کو ریسرچ کے خصوصی طریقہ کار کی حدود میں رہنا چاہیے۔ اسکالر کو طریقہ کار سے بخوبی واقف ہونا چاہیے اسی حد تک کہ اس کا ہر تحقیقی عمل بے توجہی سے مبرا ہو۔ ایسا کرنے سے جو ڈیزائن ترتیب پائے گا وہ خالص سائنسی ہوگا جو اور کسی دوسرے طریقہ سے سائنسی نہیں بن سکتا۔

ریسرچ ڈیزائن کی ضرورت جو سائنسی طریقہ کار کی حدود میں رہ کر پوری ہوتی ہے۔ حسب ذیل امور کی بنا پر پیش آتی ہے۔

(۱) بہت سی تحقیق میں اسکالر کو تفتیش و تلاش کے سلسلہ میں جمع کیے گئے اعداد و شمار کی معنویت اور افادیت کا مکمل شعور نہیں ہوتا۔ وہ یہ طے نہیں کر پاتا کہ کس حد تک غیر ضروری اطلاعات اور معلومات کو برداشت کیا جائے۔ اگر وہ ان کمزوریوں سے واقف ہے تو وہ ریسرچ ڈیزائن کی ترتیب کی مدد سے دُور کر سکتا ہے۔

(۲) بہت سے ریسرچ پروجکٹس میں معینہ مدت سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔ اس طرح اس کی شناخت اور تجزیہ میں مزید اوقات ضائع ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ریسرچ ڈیزائن کی تکنک سے اسکالر آگاہ ہے اور اس نے اپنے پروجکٹ کا ریسرچ ڈیزائن بنایا ہے تو وہ بہت کم وقت میں اپنا کام کرلے گا۔ تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو کی تلاش آج کے سماجی اور ادبی تحقیق کا ایک اہم نکتہ بن چکا ہے۔ اس کی خاطر غیر ضروری دوڑ دھوپ، پریشانی مول لینی پڑتی ہے لیکن ڈیزائن بن جانے کے بعد غیر ضروری پریشانیوں سے اُس کو نجات مل جاتی ہے۔ جب تک ریسرچ کا مناسب پلان نہیں کیا گیا ہے۔ اسکالر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔

(۳) ACKOFF نے ایک معیاری اور اعلیٰ ریسرچ ڈیزائن کے سلسلہ میں لکھا ہے:

"THE IDEALIZED RESEARCH DESIGN IS CONCERNED WITH SPECIFYING

THE OPTIMUM RESEARCH PROCEIDURE THAT COULD BE FOLLOWED WERE THERE NO PRACTICAL RESTRICTIONS

پہلی نظر میں ACKOFF کا بیان قابل عمل نہیں معلوم ہوتا اور اسکالر پوچھ سکتا ہے کہ اُن طریقہ کار کی واقفیت حاصل کرنے سے فائدہ کیا، جن پر کاربند نہیں ہوا جاسکتا۔ لیکن ماہرین نے OPTIMUM RESEARCH CONDITION کے لیے اسے ضروری قرار دیا ہے۔ عملی ریسرچ ڈیزائن چار اہم نکات پر مبنی ہے۔

(۱) فطرت سے ہم آہنگی پیدا کرنے یا اس میں نئی حقیقتوں کی تلاش کے ذریعہ کسی مفروضہ کی تخلیق کرنا تاکہ ریسرچ کا مسئلہ نئے طریقہ سے سامنے آسکے۔

(۲) کسی خاص حالت، فرد یا جماعت کی خصوصیات کو بیان کرنے کے سلسلہ میں اس ڈیزائن کی ضرورت ہے اس ضمن میں جس قسم کا مطالعہ کیا جاتا ہے اُسے DISCRIPTIVE STUDIES کہتے ہیں۔

(۳) کسی واقعہ کے تواتر سے ہونے، اُس کا مطالعہ کیا جاتا اسی دائرہ میں آتا ہے۔ اس طرح کا مطالعہ مقصود ہو تو اُسے DIAGNOSTIC STUDIES کہتے ہیں۔

(۴) مفروضہ کے تشخص کی خاطر (افتراقات) VARIABLES کے آپسی رشتہ کا مطالعہ جسے تجرباتی مطالعہ کہتے ہیں اس قسم میں شامل ہے

وضاحتی اور تجرباتی مطالعوں میں صحت اور درستی مطالعہ شرط ہے۔ تاکہ تعصبات سے اسکالر بری ہو کر شہادتوں کو جمع کرے۔ ان دونوں قسموں کے ذریعہ ریسرچ ڈیزائن کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ وہ مطالعہ جہاں مفروضہ کا امتحان مقصود ہو (یعنی تجرباتی مطالعہ) قواعد وضوابط سے آزاد نہیں ہے ہاں اس کے ذریعہ اسکالر کا تعصب کم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تجربوں کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

تفتیش وتلاش کی خاطر کیے جانے والے مطالعہ کا خاص مقصد کسی مسئلہ کو اصولی شکل میں ترتیب دینا ہوتا ہے۔ تاکہ اسکالر دلچسپی لے اور ریسرچ ڈیزائن کی بہتر ترتیب و پیش کش کی جا سکے۔ کیوں کہ بقول MAX WEBER

"EVERY SCIENTIFIC FULFILMENT RAISES NEW QUESTIONS IT ASKS TO BE SURPASSED AND OUT DATED."

مفروضات اور اُن کی نوعیت

ریسرچ کا آغاز کسی نہ کسی مسئلہ سے ہوتا ہے یا کوئی دشواری اس کی ابتدا کرتی ہے اور پھر ذہن تحقیق کی طرف مائل ہوتا ہے اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ جو دشواریاں نتائج کی راہ میں حائل ہوں، اور مقاصد کی برآری میں سدِّ راہ ہیں انھیں دُور کیا جائے تاکہ صحیح حل کا راستہ ہموار ہو سکے۔

اس لیے بہتر صورت یہ ہوتی ہے کہ اسکالر اپنی دشواریوں اور موضوع سے متعلق مسائل کا ایک واضح نقشہ اپنے سامنے رکھے اور پھر اُسے حل کرنے کی طرف

مائل ہو۔ انھیں مسائل اور دشواریوں کو حل کرنے کے لیے ایک مفروضہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ مفروضات تحقیق کے دوران صحیح ثابت ہوں لیکن اسے غلط ثابت کرنے کے لیے بھی تحقیق کی راہوں سے گزرنا ہے۔ لہذا مفروضات کا ذہن میں صاف نقشہ موجود رہنا ضروری ہے۔ جب یہ احاطہ تحریر میں آگیا تو اسے پانے کے لیے مفروضات کے تمام چھوٹے بڑے نکات اُبھر جاتے ہیں، جنھیں ایک اسکالر حقایق کی روشنی میں پرکھتا ہے۔ اگر مفروضہ درست نہیں ہے یا سرے سے بنایا ہی نہیں گیا ہے تو اسکالر کا ذہن کبھی منطقی طور پر سوچ بھی نہیں سکتا اس کی تحقیق آگے نہیں بڑھ سکتی۔ گویا مفروضہ کی نوعیت نگراں کی ہوتی ہے جو ہر لمحہ اسکالر کو ہدایت دیتا رہتا ہے۔ اگر ہدایت کا یہ سرچشمہ ہوشیاری، دیانت اور بہتر طور پر تیار نہیں کیا گیا ہے تو تحقیق مکمل نہیں ہوگی۔ مفروضہ اسکالر کو حقایق اور اعداد و شمار کی ایک وسیع و عریض دُنیا میں لے آتا ہے، جہاں اُسے اپنے کام کے مواد کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ یہ مواد ایسا ہوتا ہے جو معنویت سے پُر ہوتا ہے اور جو مسائل کے حل کرنے میں مدد کرتا ہے۔ مواد کی صرف فراہمی تحقیق کے مسائل کو حل نہیں کرتی بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ مثبت اور منفی مواد الگ الگ حاصل کیے گئے ہوں تاکہ اپنے نقطۂ نظر کی تردید اور تائید میں مدد مل سکے۔ نقطۂ نظر کی یہی دنیا مفروضات کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے بغیر کسی قسم کی تحقیق ممکن نہیں۔ LENDBERG مفروضات کی وضاحت اس طرح کرتا ہے:۔

THE ONLY DIFFERENCE BETWEEN GATHERING DATA WITHOUT A HYPOTHESIS AND GATHERING THEM WITH IS

THAT IN THE LATTER CASE WE DELI
-BERATEY RECOGNIZE THE LIMITATIONS
OF OUR SENSES AND ATTEMPT TO
REDUCE THEIR FALLIBILITY BY
LIMITING OUR FIELD OF INVESTIGATION
SO AS TO PREVENT GREATER CON-
-CENTRATION OF ATTENTION ON
PARTICULAR ASPECTS WHICH PAST
EXPERIENCE LEADS US TO BELIEVE
ARE INSIGNIFICANT FOR OUR PURPOSE

P. 65

METHODOLOGY AND TECHNIQUE
OF SOCIAL RESEARCH
[WILKINSON & BHANLARKAR]

مفروضہ کے سلسلہ میں عام طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی مدد
سے مواد کی نوعیت اُن کی فراہمی کے ذرایع تک آسانی سے اسکالر کی رسائی
ہو جاتی ہے جس کے بغیر محقق جواب نہیں بچھ سکتا۔ اس کی روشنی میں مواد
کی ترتیب و تزئین بھی کی جاتی ہے۔ یوں مفروضہ کی تکنیکی تعریف مقصود ہو تو

WEBSTER NEW INTERNATIONAL DICTIONARY
OF ENGLISH LANGUAGE 1956

کی بتائی ہوئی تعریف دیکھنی چاہیے ۔

" THE WORD HYPOTHESIS, AS A PRO-
-POSITION, CONDITION OR PRINCIPLE
WHICH IS ASSUMED PERHAPS WITH
OUT BELIEF, IN ORDER TO DRAW OUT
ITS LOGICAL CONSEQUENCES AND
BY THIS METHOD, TO TEST ITS ACORD
WITH FACTS WHICH ARE KNOWN
ASMAY BE DETERMINED"

NAGAL اور COHEN اس سے دو قدم آگے بڑھ کر
لکھتے ہیں:۔

" WE COMOT TAKE A SINGLE STEP
FORWORD IN ANY ENQIRY UNLESS WE
BEGIN WITH A SUGGESTED EXPLANATION
OR SOLUTION OF THE DIFFICULTY
WHICH ORIGINATED IT. SUCH TENTATIVE
EXPLANATIONS ARE SUGGESTED TO US
BY SOMETHING IN THE SUBJCET MATTER
AND BY ONE PREVIOUS KNOWLEDGE.
WHEN THEY ARE FORMULATED AS

PROPOSITIONS, THEY ARE CALLED HYPOTHESIS "۔

ایک بار جب اسکالر اپنے مسائل اور اس کی نوعیت کو سمجھ لیتا ہے تو وہ اُس کے حل کا ایک مبہم سا خاکہ ذہن میں ضرور تیار کر لیتا ہے۔ مشکل سوالات کا بالکل ٹھیک نہیں تو ایک حد تک صحیح جواب کے قریب وہ پہنچ جاتا ہے۔ اب WERKMEISTER کے مطابق یہی خیال اور قریب تر جواب یا حل مفروضہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ یا تو مسائل کا حل پیش کر دیتا ہے یا اُسے مزید تحقیق کی طرف آمادہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جانا غلط نہیں ہے کہ مفروضہ عارضی ضابطہ سازی ہے۔ اسکالر اس تصور سے تحقیق کی ابتدا کرتا ہے کہ اس نے جو مفروضہ بنایا ہے وہ صحیح ہے۔ اپنے اسی موقف کی وجہ سے وہ مشاہدات، مطالعہ اور اُس کے منطقی نتائج تک بہ آسانی پہنچتا ہے۔ اگر اُس کا مفروضہ درست ہے تو وہ مشاہدات اور مطالعہ کے دوران اپنی صداقت کا ثبوت فراہم کر دے گا، اور اگر غلط ہے تو بھی اُس کی تصدیق کرے گا۔ اگر مفروضہ معیار پر صحیح وسالم اُتر گیا تو اسکالر کی منزل قریب آگئی اور اس کو مسائل کا حل مل گیا۔ لیکن اگر مفروضہ کی تردید ہو گی تو اسکالر کو مجبوراً مفروضہ میں تبدیلی کرنی ہو گی اور پھر اُس کو تجربات کی روشنی میں پرکھنا ہو گا۔ اس طرح ایک مفروضہ تحقیق کی درمیانی منزل کی طرح سامنے آتا ہے جہاں سے وہ پھر مسائل کی نوعیت کا جائزہ لے سکتا ہے اور مزید اعداد و شمار جمع کر سکتا ہے۔

مفروضہ اصولی شکل میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ یعنی کیوں کس طرح

اور کیا جیسے سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے قریب مفروضہ کی اصولی شکل آجاتی ہے۔ مفروضہ مختلف شکلوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں اسکالر اور نگراں کی ذہانت اخذ کرنے کی صلاحیت اور نظریاتی لباس پہنانے کی متانت بھی ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خاصا مشکل کام ہے اور ابتدا میں اس کی رفتار بے حد سست ہوتی ہے اس لیے جو اسکالر تخیل کی دولت سے محروم ہیں اور علم سے بھی بہرہ مند نہیں تحقیق ان کے بس کی بات نہیں۔

جب COHEN اور NAGEL یہ کہتے ہیں کہ مفروضہ کے بغیر ایک قدم بھی آگے بڑھنا مشکل ہے تو وہ صرف مفروضہ کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیتے ہیں تاکہ اسکالر تلاش و جستجو کی راہوں کو بہ آسانی طے کر سکے۔ اس لیے تحقیق کی ابتدا ہی میں مفروضہ کی تعمیر اُس کی اہمیت کو محسوس کرنا لازمی ہے اور یہ شعور بھی ضروری ہے کہ پوری تحقیق میں مفروضہ کا کردار بے حد اہم ہوتا ہے۔ CHADDOCK مفروضہ کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

مفروضہ سائنس کی زبان میں دریافت شدہ حقائق کی تشریح و تفسیر ہے۔ وہ تفتیش کو بامعنی بناتا ہے۔ تلاش و جستجو کی راہوں کو طے کرتا ہے۔ اس کے بغیر اسکالر نہ جمع کیے گئے مواد کا مناسب استعمال کر سکتا ہے اور نہ غیر ضروری مواد کو خارج کر سکتا ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک مفروضہ کی عدم موجودگی میں وہ بالکل اُلٹا کام کر دے۔ اس لیے تحقیق کی ابتدا میں ہی نگراں اور اسکالر دونوں کو مفروضہ کی ہئیت اور نوعیت کو سمجھ لینا چاہئے۔

مفروضہ بھی ایک نہیں ہوتا۔ اس کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ قسمیں صرف مجرد تصورات کی بنیاد پر ہی کارآمد ہوتی ہیں۔ GOODE اور HATT دونوں نے ہی مجرد تصورات کے تئیں تغیر پذیر معیار کا جائزہ

لیا ہے۔ پھر مفروضات کے سرچشمہ سے بحث کی ہے۔ ادب اور سائنس کے ہزار سالہ تاریخی سرمایہ سے مفروضات لیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی محقق کی اپنی افتادِ طبع کی حیرت انگیزی مفروضہ کو جنم دیتی ہے۔ کہیں عوامی عقاید، تصورات اور نظریات کی بنیاد پر مفروضات بنائے جاتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ اُردو ادب کا اسکالر صرف میرؔ اور غالبؔ تک اپنی تحقیق کو محدود رکھے اور اپنے کلاسکی ادبی سرمایہ کی بنیاد پر ہی مفروضہ کو تلاش کرے۔ وہ عصری علوم اور دانش وروں کے کارناموں کو بھی پیش نظر رکھ سکتا ہے۔ مثال کے لیے وہ اُردو میں 'فیملی پلاننگ' پر تخلیق کیے گئے ادب کو موضوع بنائے اور اس طرح کا مفروضہ تعمیر کرے جس سے اس حقیقت کا پتہ چلے کہ اُردو معاشرہ میں فیملی پلاننگ اس لیے مقبول نہیں ہو سکتی کہ وہاں مذہب ایک بڑی روکاوٹ ہے۔ چنانچہ مذہب معاشرہ کی اصلاح اور خوش حالی کی راہ میں روکاوٹ ہو گیا ہے۔ اب اس طرح کا ادب صرف کلاسکی روایات کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ بلکہ عصری آگہی کے زیرِ اثر تراشا گیا مفروضہ اسکالر کو مجبور کرے گا کہ وہ سماجی علوم اور بدلتے ہوئے حالات کو اپنے ریسرچ کا موضوع بنائے اور پھر اس سے متاثر ہو کر مفروضہ اپنی نئی شکل و صورت اختیار کرے گا اور نئے سماجی و معاشرتی حالات مفروضہ کا سرچشمہ قرار پائیں گے۔ بعض مفروضے نظریات کی دین بھی ہوتے ہیں۔ ان نظریات کی تائید میں بھی مفروضہ بنتے ہیں اور ان کی تردید میں بھی۔ مارکسی جمالیات پر اگر ریسرچ کیا جا رہا ہے تو ضرورت اس بات کی ہو گی کہ مارکسزم اور جمالیات دونوں کے مختلف اسکول کا جائزہ لیا جائے۔ ان میں سے اگر ایک کی تائید یا تردید مقصود ہے تو مفروضہ کی ہئیت میں ویسی ہی تبدیلی کرنی ہو گی اور بنیادی باتیں

پیش نظر رکھنی ہوں گی۔

اس طرح اگر اُردو زبان کو ایک کلچر کے فارم میں کوئی اسکالر دیکھنا چاہتا ہے تو اُسے اپنے مفروضہ کو کلچر کی تعریف، اُس کی وسعت کی روشنی میں ترتیب دینا ہوگا۔ اب کلچر کا مطالعہ اور اُردو بولنے والوں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ بھی سامنے رکھنی ہوگی اس طرح اسکالر صرف کلاسکی ادبی خزانوں تک اپنی واقفیت کی دُنیا محدود نہیں رکھ سکتا۔ اُسے سماجی زندگی کے بالائی زینوں تک چڑھنا ہوگا۔ اس لیے میں برابر اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ ادب اور آرٹ کا مطالعہ اس وقت محض ایک نقطۂ نظر سے کرنا درست نہیں۔ بلکہ اس کا INTERDISCIPLINARY مطالعہ ضروری ہے۔ لہٰذا اچھے اور کامیاب مفروضہ کے لیے LARRBEE کی زبان میں ماضی کا تجربہ اور قوت تخیل دونوں ہی لازمی ہیں۔ ماضی لاکھوں سال کی ثقافت و تہذیب کا بڑا انمول خزانہ پوشیدہ رکھتا ہے اور انسان کی قوت تخیل اُس سے جب چاہے خوب صورت پیکر تراش لیتی ہے۔ یہاں اُس کا عمل بڑے سنگ تراش کا سا ہوتا ہے، جو بے رونق، بھدّے پتھروں کو اپنے خونِ جگر سے رنگین بنا کر ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔

اب مفروضہ کے عناصر اور خصوصیات کا بھی جائزہ لے لیں۔

(۱) ایک مفروضہ تجرباتی نقطۂ نظر سے قابل قبول ہو۔ تاکہ اُس سے ضروری نتائج برآمد ہو سکیں۔

(۲) مفروضہ ایسا ہو جس پر تحقیق کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہو جہاں مشاہدات اور مطالعہ کے ذریعہ حقایق کی از سر نو تشریح و تفسیر ممکن ہو۔

(۳) نظریاتی نقطۂ نظر سے اس کی شکل وصورت واضح ہو۔
تصور اور نظریہ کی وضاحت ہونی چاہئے۔ کوئی چیز پیچیدہ
اور گنجلک نہ ہو۔

(۴) مفروضہ کا بالکل ہی غیر مبہم ہونا ضروری ہے اور کوئی عمومی
بات نہیں ہونی چاہئے۔

(۵) بہتر ہو اگر مفروضہ کسی تصور یا نظریہ سے متعلق ہو۔
اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نئے تصورات سامنے
آتے ہیں۔ ایک مثال کے ذریعہ یہ بات واضح ہو جائے گی۔ 'جدیدیت' کے
موضوع پر پچھلے چند برسوں سے اردو کے ادیب وشاعر اپنے اپنے خیالات
کا اظہار کر رہے ہیں۔ اب اگر ان پر کوئی اسکالر تحقیق کرنا چاہے تو اس کو
اپنا مفروضہ ایسا بنانا ہوگا جس کی بنیاد نظریات پر رکھنی ہوگی۔ اب فلسفہ
کے مختلف اسکول سامنے آئیں گے اور مختلف مشرقی و مغربی تصورات بھی
زیر بحث ہوں گے۔ اس طرح بہت ممکن ہے جدیدیت کی اس بحث اور تحقیق
میں، کوئی نئی بات، کوئی نیا نظریہ ابھر کر سامنے آئے۔ یا جدیدیت
بحیثیت فلسفہ ہی غائب ہو جائے۔ مگر یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب
مفروضہ کی تعمیر سائنسی ہو اور ان حقایق کی طرف اسکالر راغب ہو، جن کا
ذکر کیا گیا ہے۔

تصوّرات

نظریات وتصورات کا تحقیق اور اس کے طریقہ کار میں
بڑا دخل ہے۔ تصورات، مشاہدات کی منزلوں سے

گزرتی ہوئی اشیاء کا ماورائی نام ہے۔ اس کے دائرہ میں حادثات اور ماحول شامل ہیں۔ جن میں شب و روز زندہ رہنے والا انسان بغیر کسی نظریہ کی وضاحت یا وجود و عدم سے قطعی غافل رہتا ہے۔ لیکن ان ہی سینکڑوں انسانوں میں بعض ذہن دن رات رونما ہونے والے واقعات اور حادثات سے استفادہ حاصل کرتے ہیں وہ انھیں بنیاد بنا کر کسی مخصوص تصور کی فلسفیانہ وضاحت کرتے ہیں اور مخصوص تصورات، مشاہدات اور تجربات و حادثات کی راہوں سے گزرتے ہوئے کسی نئے نظام حیات کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ اسی لیے PARSONS کہتا ہے کہ کوئی بھی تجزیاتی علم ایسا نہیں ہے جس کا کسی نہ کسی طرح تصور یا نظریہ سے کوئی رشتہ رہا ہو۔ لہذا تحقیق کا بنیادی خاکہ بناتے وقت ذہن میں چند تصورات بھی قائم ہوتے ہیں یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مخصوص تصورات کی بنیاد پر ہی بعض تحقیقی مفروضات جنم لیتے ہیں اور اسکالر یا محقق ان ہی مبہم تصورات پر عمارت کی بنیاد رکھتا ہے۔ جوں جوں تحقیقی کام آگے بڑھتا ہے اس عمارت میں استحکام آتا جاتا ہے اور جب تصورات واضح اور صاف ہو جاتے ہیں تو مفروضات کا استدلالی نظام بے حد توانا اور تابناک ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی پیچیدگی اور ابہام باقی نہیں رہتا۔ اس طرح تحقیق میں نظریہ اور تصور کی بڑی اہمیت ہے۔ اسے اسکالر اور اس کے نگراں کو شروع ہی میں سمجھنا چاہئے۔

بعض تصور ہمارے تحقیقی مقاصد اور حقائق سے قریب ہوتے ہیں۔ ایک اسکالر کے لیے کسی تصور کا واضح خاکہ 'نقشہ ذہن میں پہلے سے موجود رہنا ضروری ہے اور اس کا تحقیق کے طریقہ کار سے گہرا تعلق ہے۔ جب تک کوئی تصور اسکالر کے دماغ میں ہے کسی کو اس سے کوئی مطلب نہیں۔ لیکن

جب وہ اُسے کاغذ پر تحریری شکل دیتا ہے تو وہ تصور اُس کے دماغ
سے نکل کر حقائق کی دنیا میں آجاتا ہے جہاں وہ تنقید و تجزیہ کی منزلوں
سے گزرتا ہے اور ترسیل کی دشوار راہوں سے سفر کرتے وقت اسکالر کی
تمام صلاحیتوں کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے بعض تصور مطالعہ
کی دھند میں غائب ہو جائے۔ اس لیے اچھی تحقیق اپنے اختتام میں تصورات
کو واضح اور روشن کر دیتی ہے۔

سماجی علوم کی تحقیق میں ادبیات کی طرح اس کی بہت ضرورت ہے
ادبیات میں تصورات کا مسئلہ عام طور پر جمالیاتی یا فلسفیانہ ہوتا ہے۔
لیکن سماجی علوم میں اس کا تعلق معاشرتی نظام سے گہرا ہے۔ اس لیے
وضاحت شرط ہے۔ ورنہ محقق کا ایک بڑا نقص سمجھا جائے گا۔ ابتدا سے
تحقیق کی آخری منزل تک تصورات اسکالر کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اُس کے ذہن
کے دھندلکوں کو دُور کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہدایت کا فرض انجام دیتے
ہیں۔ اس سے ذہن کی پختگی ظاہر ہوتی ہے اور ریسرچ کا ایک بڑا تقاضا
پورا ہوتا ہے۔

تحقیق کا نظریات سے رشتہ

تجرباتی یا استدلالی تحقیق کا نظریات
سے گہرا رشتہ ہے۔ بغیر کسی تصور اور
نظریہ کے یہ تحقیق آگے نہیں بڑھتی۔ ایک سائنس داں اپنی تجربہ گاہ میں
برابر مصروف رہتا ہے۔ اُن تسلیم شدہ حقایق کی کھوج اور تجزیہ میں جنھیں
ایک ماڈل کی حیثیت سے لوگوں نے مان لیا ہے۔ اُس کا یہ عمل کسی نہ کسی نظریہ

بنی ہوتا ہے۔ مگر یہ بات برابر پوچھی جاتی ہے کہ تحقیق اشیاء کی افادیت
کے تجربہ کے دوران کیوں کسی نظریہ کے تابع ہوگی یا کس طرح وہ نظریات
تصورات کے قریب ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ان کی حیثیت
ایسے ہم راہی کی ہے جن کے سفر کا آغاز ایک خاص منزل سے ہوتا ہے۔ لیکن
زندگی میں پھر کبھی ایک مقام پر نہیں ملتے"۔

نظریات کا لفظ ان دنوں اس قدر عام ہو گیا ہے کہ ہر کس و ناکس اپنے
ناقص، بھونڈے اور بیہودہ خیالات کو نظریات کا نام دے دیتا ہے۔
لیکن اس کے سائنسی مفہوم کو اسکالر کے لیے سمجھنا ضروری ہے تاکہ وہ بآسانی
اس کے عام اور ناقص مفہوم سے ممیز کر سکے۔ عام طور پر خیالات کو ہی نظریہ کا
لباس پہنا دیا جاتا ہے۔

جو شئے اصولی اور نظریاتی ہوتی ہے اُس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے
کہ وہ غیر حقیقی، تصوراتی اور غیر عملی ہوتی ہے۔ MERTON کہتا ہے کہ صرف
ماہر سماجیات کے نزدیک اس کے چھ سے زیادہ مطالب ہیں۔ زمانہ قدیم
میں آرام طلبی کے ساتھ کسی وہم اور تصور کو نظریہ کا نام بھی دیا جاتا تھا حالانکہ
اس کی پشت پناہی کسی طرح کا استدلالی نظام نہیں کرتا تھا۔ لیکن جوں جوں
علم و دانش کی فتح ہوتی گئی نظریہ اور مشاہدات کا رشتہ ایک دوسرے سے
مضبوط ہوتا گیا۔ فی الحال کسی نظریہ یا اصول کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ
جو معلومات اور علم کی دُنیا ہمیں میسر ہے اُس کے ذریعہ مشاہدات کی تشریح
کی جا سکے۔ KARL POPPER اپنی تخلیق LOGIC OF
SCIENTIFIC DISCOVERY میں اس کی وضاحت کرتا ہے:

" THEORIES ARE NETS CAST TO

CATCH, WHAT WE CALL THE WORLD, TO RITIONALZE, TO EXPLAIN AND TO MASTER IT. WE ENDEAVOUR TO MESH FINER AND FINER."[۲۰]

عہد پارینہ کے برعکس جب کہ اصولوں اور نظریوں کی بنیاد کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ عہد میں کسی نظریہ کو برابر چیلنج کیا جاتا ہے۔ خواہ مخصوص اصولوں اور نظریوں کی فکری پشت پناہی کیوں نہ کی جا رہی ہو اور حقایق کا بڑا خزانہ استدلالی نظام کی شکل میں اُس کی اعانت کے لیے کیوں نہ کھڑا ہو۔ یہ اصول و نظریہ تنقید سے ماورا نہیں سمجھے جاتے اور ان کی روشنی میں اُن پر نظر ثانی ہوتی رہتی ہے ایک وقت تھا جب نیوٹن کے دریافت شدہ فطری قوانین حیرت انگیز انکشافات کی طرح سامنے آئے تھے لیکن آئین اسٹائین نے اپنے نظریہ اضافیت کے ذریعہ نیوٹن کی تمام تحقیق کو رد کر دیا۔ رد کرنے کا یہ عمل بیسویں صدی میں زمانہ قدیم کی بہ نسبت بہت آسان ہے۔ اس کے لیے سائنس داں کو آرکیمڈیس کی طرح اپنی جان گنوانے کا خطرہ مول لینا نہیں پڑتا۔ یہ نئی فضا اُس تجرباتی تحقیق کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ جس کا اصول و نظریہ سے گہرا رشتہ ہے۔ اس وقت کی سائنس تمام دریافتوں کو عارضی سمجھتی ہے۔ اُس نے صرف دُنیا کا چہرہ نہیں بدلا بلکہ اپنی شکل و صورت بھی بدل ڈالی ہے۔ آج سائنسی طریقہ کار کی اہمیت علم کے تمام شعبوں میں ہو گئی ہے۔ اس نے طریقۂ کار پر زور دیا ہے۔ اس طریقہ کار کے ذریعہ ہی مختلف علوم میں

تھیوری کی دُنیا بدلتی رہتی ہے اس کے ذریعہ ہماری فکر و نظر میں بڑا انقلاب رونما ہوتا ہے۔

JOHN GALTUNG تھیوری کو مفروضات کا ایک سیٹ سمجھتا ہے جسے نتیجہ اور مفہوم نے استنباط کے ذریعہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس وقت کا علم سائنس داں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بدلے ہوئے حقایق کی روشنی میں نئے اصول و نظریات بنائے اور اس کی بھی وضاحت کرے کہ کس طرح یہ اصول و نظریات، اُن مشاہدات کی تشریح کرتے ہیں جن سے ہم سب دوچار ہوتے ہیں۔

کسی خاص تھیوری کا یہ مقصد بھی ہونا چاہیے کہ وہ اُن مشاہدات کی طرف اشارہ کرے، جن کے ذریعہ اس تھیوری کو چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ تھیوری کے ذریعہ ہی تحقیق کرانے کی منزلیں آسان ہوتی ہیں۔ ایک طرح سے رہنمائی کرتی ہے۔ آئین اسٹائن تو یہ بھی کہتا ہے کہ تھیوری ہی یہ بتاتی ہے کہ کن چیزوں یا کن حقایق کو مشاہدات کے دائرہ میں لایا جائے۔ پھر تھیوری ہی تحقیق میں نتائج کی اہمیت روشن کرتی ہے اور تحقیق جب اپنی آخری منزل میں پہنچ جاتی ہے تو اسکالر نظریاتی طور پر بے حد کھُلے ذہن کا فرد معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پاس اپنے موضوع سے متعلق اصولی طور پر کوئی بات ناقابل فہم نہیں رہ جاتی۔ وہ اپنی تحقیق کے ذریعہ جس نتیجہ تک پہنچتا ہے وہیں سے وہ مستقبل میں پیدا ہونے والے سوال نامہ کو بھی جنم دیتا ہے۔ اس طرح اصولوں اور نظریوں کا تحقیق سے رشتہ دو طرفہ ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف تھیوری ہی تحقیق کی اعانت نہیں کرتی بلکہ تجرباتی تحقیق اصولوں اور

نظریوں کی کس طرح تشکیل کرتی ہے وہ بھی قابل لحاظ ہے۔

تجرباتی تحقیق کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ وہ اُن مفروضات کی تصدیق اور جانچ کرے جو مسلمہ اصول و نظریہ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ مخصوص حالات کی روشنی میں ماہر سماجیات کی پیشین گوئیاں یا اُن کے ذریعہ بنائے گئے قوانین اور نظریات کس حد تک صداقت پر مبنی ہیں اور کہاں تک اُن میں حقایق کا پر تو پوشیدہ ہے یہ دیکھنا محقق اور تجرباتی تحقیق کا خاص کام ہے۔ اگر ان مفروضات کی جانچ کی گئی اور ان کی تصدیق کے بعد بھی اصول و نظریہ کی دیواریں مستحکم ہیں تو یہ بات مان لینی چاہیے کہ ماہر سماجیات نے جو اصول و نظریہ بنائے وہ تجربوں کی دنیا میں صحیح ثابت ہوئے۔

تحقیق چار طرح کے اہم رول ادا کرتی ہے جن کی مدد سے کسی اصول و نظریہ کی شکل و صورت سامنے اُبھرتی ہے:

(۱) سائنسی تحقیق کبھی کبھی ایسے انکشافات کو جنم دیتی ہے جو نئے نظریوں کی تشکیل کے طالب ہوتے ہیں اور موضوع کے دائرہ میں اپنی ایک نئی جگہ بناتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ پُرانی تحقیق کے ذریعہ جو چیز حاصل ہوئی اُسے ضائع کر دیا جائے۔ بلکہ آئین اسٹائن کے لفظوں میں صرف یہ احساس رہنا ضروری ہے کہ یہ قدیم تحقیق کی منزل اب سے بہت چھوٹی اور غیر اہم معلوم ہوتی ہے لیکن اس چھوٹی اور غیر اہم منزل سے ہی ایک بڑی شئے کی دریافت ہوتی ہے۔ جھونپڑی سے آج SKYSCRPPER کا تصور سامنے آیا ہے۔

تحقیق کے دوران ڈاٹا جمع کرنے کے قاعدے اور سفر میں

بہت سی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان غلطیوں کا تعلق ہمارے مشاہدات کی دُنیا سے ہے جس کے متعلق پہلے سے کبھی سوچا نہیں گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں جو چیزیں سامنے آتی ہیں وہ نئے مفروضات کا تقاضا کرتی ہیں اور ان نئے مفروضات کی مدد سے نئی تھیوری جنم لیتی ہے۔

(۲) ریسرچ کسی تھیوری کو از سرِ نو زندہ بھی کرتا ہے یا اُسے نئی شکل میں پیش کرتا ہے۔ حقایق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے مشاہدات کی دُنیا صحیح نہیں ہوتی۔ جب اسکالر اُن پر غور کرتا ہے تو وہ ان حقایق کا نئے سرے سے جائزہ لیتا ہے اور تھیوری کی بالکل بدلی ہوتی ہئیت سامنے آتی ہے۔ شاعری میں نظیر اکبر آبادی کی مثال سے اُردو کے قارئین آسانی سے سمجھ لیں گے۔ عرصہ دراز تک نظیر اکبر آبادی کو قابلِ لحاظ شاعر نہیں تسلیم کیا گیا۔ لیکن برسوں بعد جب ایک ناقد نے اُسے اُردو شاعری کے آسمان پر تنہا ستارہ کی طرح روشن کہا تو اچانک شاعر کے تئیں پورا شعری رویہ بدل گیا۔ اسی طرح اقبال کی بھی مثال دی جاسکتی ہے۔ یہ ریسرچ کا ہی کمال ہے کہ اُس نے پرانی تھیوری کو اپنے استدلالی نظام کے ذریعہ بدل دیا اور اُن کی جگہ فکر و نظر سے معمور نئی تھیوری پیش کی۔

(۳) تجرباتی ریسرچ قدیم تھیوری کو از سرِ نو روشنی میں لاتا ہے۔ جیسے جیسے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے نئے ڈسپلن جنم لیتی رہتی ہے پُرانے اصول و نظریہ نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ اُنھیں سائنس داں اپنی تجربہ گاہوں، دانشور اپنے تصوراتی محلوں اور ادیب و شاعر

اپنے دین کے نہاں خانوں میں تجزیہ کی منزلوں سے گزارتے رہتے ہیں اور جب وہ تمام مرحلوں سے گزر کر سامنے آتے ہیں تو یا تو اُن کی اصلی شکل برقرار رہتی ہے یا بدل جاتی ہے۔ اس بدلی ہوئی شکل کو ریسرچ نیا لباس عطا کرتا ہے۔ ریسرچ اصول و نظریہ کی تشریح بھی کرتا ہے۔ ریسرچ محض تصورات کی بنیاد پر آگے کی منزلیں طے نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے تجرباتی تحقیق کی نشان دہی ضروری ہے۔ تصورات محض تصورات رہتے ہیں۔ اگر ریسرچ کے طریقۂ کار کے ذریعہ انھیں تجزیاتی تحقیق کی تجربہ گاہ میں نہ لایا جائے۔ اس لیے نظریہ اور تحقیق ایک دوسرے سے قریبی رشتہ رکھتے ہیں اور ان کا آزادانہ وجود سائنسی نقطۂ نظر سے بے معنی ہے۔

باب سوم

مواد کی حصول یابی اور یکجائی
(DATA COLLECTION)

ریسرچ کی سب سے اہم منزل DATA جمع کرنے کی ہوتی ہے۔ اس موضوع پر بہت سے افراد نے مواد کی فراہمی اور DATA جمع کرنے کے مختلف ذرایع سے بحث کی ہے اور ترکیبیں بتائی ہیں۔ ان تمام ذرایع سے واقفیت حاصل کرنی نگراں اور اسکالر کے لیے ضروری ہے۔ عام طور سے DATA حاصل کرنے کے دو اہم ذرایع ہیں:

(۱) لائبریری کے ذریعہ کثیر مقدار میں DATA کا سرمایہ جمع ہوجاتا ہے یہ سائنس کی ریسرچ ہو یا ادب کی یا سماجی علوم کی ان کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ کتب خانہ ریسرچ کرنے والوں کے لیے ایک نعمتِ خداوندی ہوتا ہے۔ خاص طور سے ملک کی مشہور و معروف لائبریری جیسے خدابخش لائبریری یا نیشنل لائبریری۔ یہاں بیٹھ کر مطالعۂ کتب کے ذریعہ وہ سب حاصل ہوجاتا ہے جس کی اسکالر کو ضرورت ہوتی ہے مگر ایک کتب خانہ میں کوئی ضروری نہیں کہ ریسرچ کا پورا مواد مل جائے اور DATA کی ضرورت ہی نہ رہے۔ بعض چیزیں ملک کی مختلف لائبریریوں کے علمی و ادبی

سرمایہ کے مطالعہ کا مطالبہ کرتی ہیں۔ بہر حال یہ پہلا بڑا ذریعہ ہے۔

(۲) **عوام کی دُنیا** —— دوسرا ذریعہ عوامی ہے۔ بعض واقعات اور روایت کی تصدیق صرف عوام کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر ایک ہی واقعہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ کسی خاص علاقہ کے عوام دُہراتے ہیں یا اُن پر یقین رکھتے ہیں اور وہ بعید از عقل نہ ہوں تو اسکالر ان پر بھروسا کر سکتا ہے۔

ان دونوں قسموں کو PAPER SOURCE ' اور PEOPLE SOURCE بھی کہتے ہیں۔ یہ ذرائع معلومات کا ایک خزانہ فراہم کرتے ہیں۔ اس میں تاریخی ریکارڈ، ببلیوگرافی اعداد و شمار کے ریکارڈ سبھی شامل ہیں۔ عوامی ذرائع میں عام طور سے سوال نامہ اور انٹرویو شامل ہیں۔ اس کے ذریعہ معلومات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

DUCOMENTARY DATA

واقعات تاریخی ہوں یا کسی اور نوعیت کے وہ اپنی تاریخ اور نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کی دنیا یہیں تک محدود نہیں ہوتی۔ اسکالر کی منزل اس سے آگے کی ہے۔ وہ واقعات و حالات کے اسباب پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک حد تک ان کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ اسباب و علل کی وضاحت کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر ان کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔ یہ تحریری نمونے اور شہادتیں، حقایق کو جمع کرنے کا کام کرتی ہیں اور اس طرح اسکالر کی ایک بہت بڑی دشواری ختم ہو جاتی ہے۔

اب یہ روایت بن گئی ہے کہ ان ڈوکومنٹس کی بنیادی اور ثانوی حیثیت کو متعین کر دیا جائے۔ تاکہ تحریری نمونوں کی صداقت کا تجزیہ ہو سکے۔

یہ عمل بہت سے مفید نتائج کا حامل ہوگا۔ بقول JOHN MADGE رپورٹ اور ریکارڈ کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کریں۔ ریکارڈ بنیادی طور پر رواں حادثات سے تعلق رکھتا ہے اور رپورٹ اُس وقت ہوتی ہے جب کوئی حادثہ یا واقعہ ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ اسے ٹیبل کی شکل میں اس طرح پیش کر سکتے ہیں۔

بنیادی	ثانوی	عصری ریکارڈ
خطوط	تاریخی مطالعہ کے لیے	ذاتی ڈائری
ٹھیکہ	ضروری کاغذات	خود نوشت سوانح
کچہری کے ریکارڈ	فن اعداد و شمار کی تحقیق	حیات
آبادی کا سنس	جس کی بنیاد سنس اور	اداروں کی جانچ
ٹیپ ریکارڈنگ	ڈاٹا پر ہو۔	رپورٹ
	مراسلات، ریسرچ	
	رپورٹ	
	فیلڈ ورک	

یہ ٹیبل آخری نہیں ہے اس میں بہت گنجائش ہے۔ JOHN MADGE کے خیال میں کاغذات کو دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے حصہ میں کاغذات کی نوعیت ذاتی ہوتی ہے۔ اس میں ایسے واقعات ہوتے ہیں، جس کی نوعیت لکھنے والے کی اپنی ذات سے ہو۔ اس میں کوئی واقعہ اُس کی اپنی زندگی کا ہو سکتا ہے یا کسی دوسرے کی زندگی میں ہونے والے

حادثات کا وہ خود چشم دید گواہ ہو۔ یا پھر اُس کے اعتقادات اور توہمات کی وہ دُنیا ہو جس میں وہ خود گرفتار رہے۔ اس نوع کے کاغذات داخلی جذبوں اور ردعمل سے سرشار ہوتے ہیں اور ان کی شناخت بہت آسانی سے ہو جاتی ہے ان میں اور سرکاری کاغذات میں امتیاز کرنا مشکل نہیں ہوتا اور اسکالر کو کسی طرح کی دشواری نہیں ہوتی۔

ذاتی ڈوکومنٹ کسی ایک فرد کی غیر ارادی تحریر ہوتی ہے۔ اس میں اپنی زندگی کے تجربات ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ڈایری، سوانح حیات اور خطوط کے ذریعے اپنی ثقافتی زندگی کے دل چسپ مرقع بناتا ہے۔ اپنے تہذیبی اقدار کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اپنے قلم فکر سے اس کلچرل پس منظر کا خاکہ تیار کر دیتا ہے۔ جس میں زندگی کے تار و پود بکھرے ہوتے ہیں۔ ان کاغذات کو ریسرچ کی دُنیا نے کبھی بیکار نہیں سمجھا۔ بے حد نجی اور ذاتی ہونے کے باوجود اس میں ہمیشہ کام کی باتیں ملتی ہیں۔ ان سے نئی حقیقت کی تلاش میں مدد ملتی ہے۔ بعض دفعہ حیرت انگیز انکشافات ہوتے ہیں۔ خصوصی طور سے جب شخصیتوں کا مطالعہ ادب میں کیا جاتا ہے تو بسا اوقات معصوم اور مقدس مآب شخصیتوں کے کارناموں کو دیکھ کر دانتوں میں انگلیاں داب لینی پڑتی ہیں۔ بعض دل چسپ پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں۔ شبلی نعمانی کی زندگی کا جمالیاتی پہلو اور اس میں پوشیدہ جنسی جبلت کا خوب صورت اظہار اس کی اچھی مثال ہے۔ عطیہ بیگم کے نام اُن کے خطوط پڑھیے تو مولانا کی متنوع شخصیت اور اُن کی جمال پرستی کا اندازہ ہوگا۔ اسی طرح انگریزی اخبار ٹیلی گراف کلکتہ سے شائع ہونے والی اس خبر کا مطالعہ بھی کم دل چسپی سے خالی نہیں۔ (دیکھیے ۱۳، اگست ۱۹۸۳ صفحہ نمبر ۱۰ کالم ۴ بعنوان PEOPLE) کہ جارج برنارڈ شاہ کی نجی زندگی کیسی تھی۔

شا اور CUMBERLAND کی بیوی کے مابین خط و کتابت کی نوعیت کیا تھی۔ یہاں وہ مسز کمبرلینڈ کی بیوی کو MRS TWODIMPLE کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دونوں کے درمیان پیامِ محبت اُس وقت شروع ہوا جب شا کی عمر ۸۷ اور بیگم کمبرلینڈ کی ۳۵ سال تھی۔ اب شا پر ریسرچ کرنے والوں کو ان خطوط کے مل جانے سے نہ صرف دلچسپ نیا مواد مل گیا بلکہ ان خطوں سے دونوں کی زندگی کے کئی ایسے پہلو سامنے آگئے جو مختلف سماجی علوم کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ علم حیاتین کے جاننے والوں کے لیے بھی دلچسپ بن گئے ہیں۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ کوئی چھ سال چلا اور ان میں بڑی محبت اور گرمجوشی تھی۔ شا کے اسکالر اب یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ خطوط شا کی زندگی کے آخری ایام میں لکھے گئے تھے، یعنی ۱۹۵۰ کے پہلے، اور بیگم کمبرلینڈ نے دونوں افراد سے اپنی زندگی کے نئے تعلق کو آخری وقت تک نباہا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ اب ان خطوں کی اشاعت سے اُس شا کی زندگی کا نیا ورق سامنے آیا جس کے جنسی تعلقات مشہور ایکٹریس SARAH BERNAHDT سے بھی تھے۔

ایک آدمی کی نجی زندگی کا کوئی تحریری واقعہ کس طرح برسوں بعد ایک سماجی دستاویز بن جاتا ہے یہ اُس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ اسی لیے ریسرچ کے ماہرین نے ذاتی دستاویز کو ہمیشہ اہمیت دی اور آج بھی اس کی قدر و قیمت میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی۔ فرائیڈ کے حیرت انگیز انکشافات کا تعلق انسان کی اندرونی زندگی سے گہرا ہے۔ اُس نے ذاتی عقائد، توہمات اور اعمال کو شعور اور لاشعور کی دریافت کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ ایک نیا علم دُنیا کے سامنے آیا۔ اس سے انسان کی داخلی زندگی کے نشیب و فراز کا

بھی علم ہوا۔ مگر اس ذاتی دستاویز کی سب سے بڑی تنقید BLUMMER
نے کی۔ لیکن چار بڑے علم سماجیات کے ماہرین CLYDE KLUCHOHN ،
G.W. ALLPORT ، L. GOTTSCHALK اور
ROBERT ANGELL نے ذاتی دستاویز کی معنویت اور ضرورت
پر زور دیا۔ البتہ ان لوگوں نے اس کی حد بندیاں کر دیں اور دو نکات کی طرف
اسکالر کی توجہ مبذول کی۔

(۱) اوّل یہ کہ کہاں تک ذاتی خیالات کو ابدی ریکارڈ کی جگہ دی جائے۔
(۲) کیسے اور کہاں تک غیر محدود ذاتی دستاویز کو جمع کیا جائے اور مفروضہ
کی خاطر ان کا تجزیہ کیا جائے۔ کیوں کہ MADGE کی زبان میں:

"EVERY CONTRIBUTOR IS A PRISIONER
OF HIS OWN CULTURE,"

خود نوشت سوانح حیات میں ذاتی پسند، ناپسند اور ذاتی تعصبات
ہوتے ہیں۔ وہ پروپیگنڈا کی خاطر غلط بیانی بھی کر سکتا ہے یا اپنی زندگی کی
دلچسپیوں میں اس قدر ڈوبا ہوا ہو کہ چشم دید گواہ ہونے کے باوجود بھی وہ
ان کو رقم نہیں کرتا۔ البتہ ڈایری بسا اوقات تعجب خیز حقیقت کا انکشاف
کرتی ہے۔ مگر اس میں بھی مبالغہ کے عناصر رہتے ہیں۔ رہ گئی خطوں کی بات تو
اسکالر اس سے کافی مواد حاصل کرتا ہے اور یہ بنیادی ذرایع کا ایک جزو
بن جاتا ہے۔

عوامی اور سرکاری دستاویز

اخبارات خبریں شایع کرتے ہیں، رپورٹ چھاپتے ہیں لیکن یہ برابر

سچ نہیں ہوتے۔ اخبارات کے رپورٹر بہت سی پابندیوں میں کام کرتے ہیں
اور اب تو اخبار ایک انڈسٹری بن گیا ہے یا پھر بھی پارٹیوں کا ترجمان۔
اس لیے اُن کی خبروں اور رپورٹوں میں یا تو انڈسٹری کے مالک کا مفاد
وابستہ رہتا ہے یا پارٹیوں کی پالیسی کے تحت کام ہوتا ہے۔ غیر جانبدارانہ
رپورٹیں بہت کم چھپتی ہیں۔ اس لیے اُن کے ذریعہ حاصل کی گئی معلومات پر
بھروسا کرنا مشکل ہے۔ عوامی ریکارڈس اور اعداد و شمار البتہ نظر کے
سامنے ہوتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ قابل اعتماد بھی۔ مثال کے لیے پارلیامنٹ
کے ریکارڈ تحریری بیانات سے بھی زیادہ ٹیپ ریکارڈس کے ذریعہ اہم
بیانات کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ ان میں کسی قسم کی غلطیوں کی گنجایش نہیں
رہتی۔ اور اسکالر ان پر بھروسا کر سکتا ہے۔

تجارتی کاغذات بھی اپنی جگہ اہم ہیں۔ قانونی دستاویز بھی، سنسرس
رپورٹ اور حکومتِ وقت کی دوسری رپورٹیں بھی خاصی معتبر ہوتی ہیں۔ چونکہ
یہ زیادہ تر اکسپرٹس کے ذریعہ طے کی جاتی ہیں۔ اس لیے اُمید کی جاتی ہے کہ
اس میں مبالغہ آمیزی اور غلط بیانی نہیں ہوگی مگر موجودہ حالات میں ان کی
صداقت بھی مشتبہ ہو گئی ہے اور عوام کا ان پر اعتبار باقی نہیں رہا۔ اس لیے
ان کی چھان بین بھی اسکالر کو ضرور کرنی چاہیے اور آنکھ بند کر کے انھیں
حرف آخر نہیں سمجھنا چاہیے۔

اس طرح DATA کو یک جا کرنے سے بہت فائدے ہوتے ہیں ان کے
صحیح ہونے کا عمل برابر جاری رہتا ہے اور اس کے لیے بہت سے آدمیوں کی مدد
کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ڈاٹا کو جمع کرنے کے سلسلہ میں سماجی رویہ کا خصوصی مطالعہ بھی

ضروری ہے یہ کسی خاص نظریہ، تصور اور نتیجہ تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔
TRYON نے ایسے کئی مطالعوں سے تشفی بخش نتائج نکالے ہیں۔ وہ مختلف
سماجی کلچرل گروپ کے رویوں کا مطالعہ کرکے زیادہ اہم نتیجہ تک پہنچا۔ مثال
کے لیے اُس کا مفروضہ یہ تھا کہ COMMONDEMOGRAPHIC سماجی
علاقہ کے باشندے مشترک تجربوں اور حالات سے دوچار ہوتے ہیں اور
اُن کی نفسیات بھی مشترک ہوتی ہے۔ اس کی شہادت کے لیے VOTING
REORDS کو پیش کیا اور مخصوص سماجی رویہ کو ظاہر کیا۔ پروفیسر A. L.
BOWBY اسے بھی تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں اور کامل اعتماد کرنے سے
منع کرتے ہیں۔ پھر سوانح حیات بھی سامنے ہے۔ سوانح حیات کے ذریعہ دستاویز
کا سرمایہ پھیل سا جاتا ہے۔ اسکالر کی دشواری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس
کے تجزیہ اور حصول میں بھی مشکلیں پیش آتی ہیں لیکن اسے آنکھ بند کرکے چھوڑ
نہیں سکتے۔

تاریخی دستاویز

یہ ایک خاص عہد کی سرکاری اور غیر سرکاری رپورٹ ہوتی ہے۔ اس کی
اہمیت اس لیے ہے کہ یہ سماجی اور معاشرتی رشتوں کی وضاحت کرتا ہے۔
کسی عہد میں کون سی قوتیں پیداواری ذرائع پر قابض تھیں اور کون سی محکوم،
ان کی زندگی کے ثقافتی پہلو کیسے تھے، علوم و فنون کی نوعیت کیا تھی۔ ان
ساری باتوں پر اس عہد کی سرکاری اور غیر سرکاری رپورٹوں کے ذریعہ
روشنی پڑتی ہے۔

تاریخی دستاویز کے بعد CASE HISTORY بھی آتی ہے۔ اس
ضمن میں جو لوگ کام کرتے ہیں وہ خصوصیت سے سماجی رویوں کا مطالعہ

کرتے ہیں ۔ یہاں اس کا امکان کم رہتا ہے کہ وہ تعصبات سے کام لیں یا مبالغہ آمیزی کو راہ دیں۔

ان تمام ذرایع میں ڈایری، خطوط اور خود نوشت سوانح حیات کی اہمیت برابر تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ کئی اہلِ قلم نے تو ذاتی ڈایری کو THE PERSONAL DOCUMENT PAR EXCELLENC کہہ کر اس کی قدر و قیمت بڑھاتی ہے۔ اس طرح ABEL نے زندگی کے ریکارڈس کے لیے ایک اصطلاح BIOGRAMS بھی استعمال کیا۔ اُس نے اپنی تخلیق WHY HITLER CAME INTO POWER میں اس طریقہ کو استعمال کیا۔ اگر لکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ تقریباً ایک ہی قسم کے تجربے سے گذرے ہیں تو بقول ABEL یہی طریقہ زیادہ کارآمد ہے۔

ڈاٹا جمع کرنے کی ایجنسیوں کے سلسلہ میں سروے کا ذکر بھی شامل ہے۔ یوں LOWRENC ROSEN نے تحقیق کی چار منزلوں کا ذکر کیا ہے۔ اُس نے اپنی کتاب A READER FOR RESEARCH METHOD میں اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اُس کے مطابق چار منزلیں حسب ذیل ہیں :—

(1) DATA SOURCE یعنی ڈاٹا کہاں سے اور کس طرح جمع ہو۔

(2) MEASUREMENT یعنی اخبارات اور نظریات کو کس طرح تحقیق کے دائرہ میں لائیں ؟

(3) DATA ANALYSIS کون سا عملی طریقہ کار انتخاب کریں تاکہ

(4) RESEARCH DISIGN موضوع کا مقصد اور مفہوم واضح ہو سکے۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ تحقیق کا اصل مسئلہ کیا ہے اور اسکالر کن باتوں کی طرف خصوصیت سے اشارہ کرتا ہے۔ وہ ڈاٹا کی مختلف ایجنسیوں کے ذریعہ نظریاتی اصولوں کی عمارت کی تعمیر کرتا ہے۔ پھر وہ خاص تصورات کیا ہیں جنھیں وہ VARIABLES کی طرح استعمال کرتا ہے۔ وہ کس طرح ان کی تعریف کرتا ہے اور کس طرح اپنے مفروضات کو ترتیب دیتا ہے۔

JOHANNES FEEST نے خصوصیت سے ڈاٹا کے سلسلہ میں بنیادی اور ثانوی ذرائع کے فرق پر زور دیا ہے۔ بنیادی ڈاٹا حوالہ بہم کرتا ہے اُن اطلاعات کی جو جمع کی جاتی ہیں۔ ثانوی ذرائع پر صرف بھروسا کر کے لکھا جاتا ہے۔ اُس کا طریقۂ کار غیر سائنسی ہوتا ہے۔ خاص کر جب رویوں کے مشاہدہ کا مسئلہ آجاتا ہے تو ثانوی طریقہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ بنیادی ذرائع کی طرح ثانوی ذرائع کی بھی قسمیں ہوتی ہیں انھیں تین خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(۱) سابقہ سماجی سائنس کا ریسرچ

(۲) سماجی ریکارڈ

(۳) ذرائع ابلاغ

مگر ان میں انسانی رویوں کا مطالعہ نہیں ہوتا۔ دراصل سماجی تجزیہ میں جدت پانے پن کے تصور کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس جدت کی پہچان علامتوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ

URBANIZATION, HIGH LEVELS OF EDUCATION INDUSTRIALIZATION, EXTENSIVE, MECHANAI--ZATION HIGH RATES OF SOCIAL MOBILITY.

ں ساری باتیں، رویوں سے منسوب ہیں۔ یہ اقدار جذبات و احساسات
اور فرد کی حرکات و سکنات سے بھی وابستہ ہیں۔ جدت کے سلسلے میں
یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ MODERNIZATION اور
MODERNISM میں بڑا فرق ہے۔ پہلے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنی
سابقہ حالت سے کوئی ملک، شہر، قوم زبردست انقلابی تبدیلیوں کی طرف
مراجعت کرتی ہے اور ماڈرن ازم وہ ہے جو پہلے سے رائج نظریات، عقائد،
اقدار، اعتقادات اور روایت کے بالکل برعکس ہو۔

اس انکشاف نے کہ سائنٹفک طریقۂ کار کے ذریعہ انسانی مسائل پر
غور و فکر کیا جاتا ہے۔ اس کی اندرونی زندگی میں جو خلفشار رہتا ہے اس کی
آئینہ داری بھی ممکن ہے اور اس کے اسباب و علل کا بھی پتہ لگایا جاسکتا ہے۔
جس نے انسان کی نفسیات کو بہت متاثر کیا ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو سارے انسان
اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس خیال نے اس وقت تقویت پائی جب
جنگوں کے رد عمل اور اثرات کے نتیجہ کے طور پر سماجی ہم آہنگی کا مسئلہ
اُٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران سماجی نفسیات کا علم
شدت سے سامنے آیا۔ ساتھ ہی ذرائع ابلاغ نے بھی سر اُٹھایا۔ پہلے کی
تحقیق کا طریق کار اس لیے غیر سائنسی تھا کہ نہ اُن کے ڈاٹا کی کوڈنگ
ہوئی تھی۔ نہ اطلاعات فراہم کرنے کے طریقوں سے آگاہی تھی یہ سب
کام وجدان اور ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے ذریعہ انجام پاتا
تھا۔ لیکن آج جب ہم تجربوں کی مختلف منزلوں سے گزرتے ہیں تو کوڈنگ
CODING کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ
سائنٹی فک ہے اور سائنسی تکنیک یہ ہے کہ اس کا اظہار اور عمل ایک خاص

معیار کا پیرایہ اختیار کرتا ہے اور ماہرین فن اس کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔
گرچہ تحقیق کے طریقۂ کار کی بنیادی منطق اور استدلال مشترک ہیں اور ہر ڈسپلن میں ڈاٹا کی ضرورت یکساں ہوتی ہے۔ اس کی نوعیت موضوع کے اعتبار سے بدل جاتی ہے۔
بہت سے علوم میں تحقیقی مسائل ادب سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ ادب میں بھی ڈاٹا کی فراہمی اور ان کی ترتیب لازمی ہے۔ لیکن بعض سماجی علوم میں تحقیق کی منزلوں سے گزرتے وقت ڈاٹا کے سرمایہ کی بنیادی نوعیت میں فرق آجاتا ہے۔ اس لیے ان کے لیے ایک نئی اصطلاح بھی وضع کی گئی ہے۔ سماجی علوم میں اس کو SAMPLING کہتے ہیں۔

ریسرچ کے طریقۂ کار کے سلسلہ میں مختلف اہل علم حضرات نے مواد اور اعداد و شمار کی یکجائی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ موضوع سے متعلق مواد اور معلومات کس طرح حاصل کی جائیں اور ان کے طریقے کیا ہیں انھیں جاننا بھی ضروری ہے۔ W. P. MONTAGUE نے حسب ذیل قسموں کو مفید اور کارآمد بتایا ہے:

(۱) AUTHORITARIANISM
(۲) INSTITUTIONALISM, MYSTICISM, RATINALISM, EMPIRICISM, PRAGMATISM, AND SCEPTICISM.

(۱) دوسروں کی رائے اور بیان کو من وعن مان لینا اور انھیں علمی واقفیت کا بنیادی ذریعہ تسلیم کرلینا اس میں شامل ہے۔ لیکن وہ اہلِ نظر جنھیں اس طرح کے بیانات کی صداقت پر شبہ ہوتا ہے یا جو جدید ذہن کے مالک ہیں۔ اس طرح کی

اہمیت نہیں دیتے۔ اس ضمن میں صرف وہی باتیں، بیانات زیر غور رہتے ہیں جو
وقت مقررہ میں کسی اہم وسیلہ سے معلوم ہوتے ہوں۔ لیکن یہ بات بھی ذہن نشین
رہنی چاہیئے کہ کوئی اسکالر اپنی تحقیق خود اپنے دل و دماغ سے پیدا نہیں کرتا بلکہ
اُس کے عمل میں صدہا افراد شامل رہتے ہیں۔ جس کا احساس اسے دورانِ تحقیق
نہیں ہوتا۔

میرے لکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ عہد قدیم کے کارناموں کو مشتبہ نظروں سے
نہیں دیکھنا چاہیئے۔ ریسرچ کی ابتدائی منزلوں میں یہ احساس ضرور پیدا ہوتا ہے۔
اس کے ذریعہ قدماء کی تحقیق کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں البتہ
واقفیت بہم پہنچانے والے کی شخصیت، عمر اور کردار بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ یعنی
وہ صادق ہے یا نہیں اور صادق ہونے کے بعد سچ کے اظہار کی جرأت رکھتا ہے؟

پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ عوام میں کوئی خیال، عقیدہ یا روایت کس حد تک
مقبول ہے۔ اُن میں کوئی تصور جتنا زیادہ مقبول اور قابلِ قبول ہوگا، اس کی
صداقت اتنی ہی بڑی ہوگی۔ البتہ دیکھنا صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ مقبولیت خود بخود
حاصل ہوتی ہے یا اس کے پیچھے کوئی پروپگنڈا کام کرتا ہے۔

عہد سے مُراد یہ ہے کہ کوئی نظریہ یا تصور کسی خاص زمانہ میں کب تک قابل
قبول رہا۔ کیا اس کا بھی تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور کوئی تصور یا خیال یقین کی منزل
تک آنے میں کتنی صدیاں گزار چکا ہے۔ ان باتوں کے پیشِ نظر احتیاط کا رویّہ
زیادہ مناسب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسکالر کو کسی مستند آدمی کے تبصرہ یا رائے
کو تسلیم کرنے میں اندھی شخصیت پرستی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

نظریۂ عقلیت PRAGMATISM : علم اور معلومات حاصل
کرنے کا یہ سب سے عمدہ طریقہ ہے۔ البتہ امریکہ میں پچھلی دو نسلوں نے اسے

سے زیادہ فیشن ایبل بنا دیا ہے۔ نظریۂ عقلیت نئے خیالات کو صلوں سے نوازتی ہے۔ یہ وہ خیال ہے جو مقصد یا اعمال کی طرف راغب یا متحرک کرتا ہے۔

RATIONAL اور AUTHORITARIAN طریقۂ کار کے نزدیک معلومات کا خزانہ حاصل کرنا بہت اہم ہے۔ ماضی دراصل تمام تصورات و خیالات اور حادثات کا خزانہ ہے۔

INSTITUTIONAL اور EMPIRICAL طریق کار کے نزدیک حال ہی سب سے زیادہ اہم ہے۔ مگر وہ ماضی کو یک لخت نظر انداز نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے نزدیک مستقبل کی تلاش و جستجو بھی پُر معنی ہے۔ کیوں کہ صداقت کی ضمانت مستقبل ہی دے سکتا ہے۔ نظریۂ عقلیت اس عنصر کو پورا کرتا ہے۔ کسی نئے خیال کی تصدیق کے لیے عمل کی دُنیا میں اُس کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اگر انجام تشفی بخش ہے تو خیالات یا نظریات صحیح ہیں اور اگر نہیں تو اُن کی جگہ دوسرے نئے خیالات پیدا ہوں گے اور ان کی جگہ لے لیں گے۔ NON - EMPRICAL عناصر امید اور خوف کو جگہ دیتا ہے۔ ایک مثال کے ذریعہ یہ بات واضح ہوگی:

> ایک شوہر کے لاپتہ ہونے کی خبر سے ہندوستانی عورتوں کے سامنے دو ہی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں یا وہ یقین کرلے گی کہ اُس کا شوہر مرگیا یا پھر یقین نہیں کرے گی۔

یہ دونوں صورتوں میں EMPIRICAL ہے۔ یہاں اُمید، خوف اور یقین کے عناصر اُس کے مستقبل کے ذہنی رویہ کو متاثر کرتے ہیں۔ چوں کہ ریسرچ کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ

RESEARCH IS THE ART OF ENQUIRING

یا

RESEARCH IS THE SCIENTIFIC PURSUIT OF TRUTH,

اس لیے مختلف ماہر تحقیق نے اس کی نوعیت پر اپنے اپنے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اور نئے زاویہ نظر سے اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے:

DESCRIPTIVE HISTORICAL INTENSIVE FACT FINDING AND PHILOSOPHICAL, MATHEMATICAL ASPECTS OF RESEARCH IN LITERATURE, ALGEBRAIC APPROACH

آخری بنیادی طور پر ریاضیاتی طریقہ ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کا تعلق صرف علم ریاضی سے ہے۔ یہ صرف ایک پیمانہ ہے، ذریعہ ہے۔ پھر SYMBOLIC MEDIUM کی بھی بات کہی گئی ہے۔ اور اس کی مثال پہلی بار ہندی میں پریم چند کے ناول "رنگ بھومی" کا VANITY FAIR سے تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں ملتی ہے۔ اس میں کرداروں کے درمیان بڑی یکسانیت تھی۔ اس کے لیے ہم MORPHOLOGY OF FOLK TALES کا بھی ذکر کر سکتے ہیں۔ دراصل ریسرچ کی نوعیت اور مواد کو سمجھنا اس وقت تک مشکل ہے جب تک ہم بتائے گئے طریقہ کار کو نہ سمجھیں انھیں ہم سائنٹی فک کہتے ہیں۔ ریسرچ ایسی کوشش ہے جس کے ذریعہ مسائل کا ذہنی اور عملی حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے سائنٹی فک طریقہ کار کا ذکر بار بار موجودہ صدی میں ہر جگہ لیا جاتا ہے۔ حقیقتوں کو سمجھنے اور ان کے تجزیہ میں گذشتہ دو صدی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

آئین اسٹائین کا کہنا ہے:

" SCIENCE IS THE ATTEMPT OF THE HUMAN MIND TO FIND A CONNECTION BETWEEN THE WORLD OF IDEAS AND WORLD OF PHENOMENA, ALL THE ESSEN-TIAL IDEAS IN SCIENCE WERE BORN IN DRAMATIC CONFLICT BETWEEN REALITY AND OUR ATEMPT AT UNDER STANDING THE SAME."

EINSTIEN AND INFLED
THE EVOLUTION OF
PHYSICS. P. 280
NEW YORK 1938

سائنٹی نقطہ نظر کے متعلق اب بھی فرسودہ خیالات کی کمی نہیں۔ یہ سمجھنا آسان ہے کہ کائنات کے تمام رازوں کو سائنس نے بے نقاب نہیں کیا ہے۔ یا فطرت پر اب اس کی دسترس کمزور ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ سائنس کے بس کی بات نہیں انسانی علم و عقل اور سائنسی طریقہ کار پر مثبت اعتقاد کی کمی ہے۔ ٹامپسن جب یہ کہتا ہے:

" THE VULGAR BELIEF THAT SCIENCE HAS EXPLAIND EVERYTHING IS A

HOPELSS MISUNDER STANDING'

J. A. THOMPSON

INTRODUCTION OF SCIENC[E]

P. 27

تو انسانی ارتقاء اور سائنٹی فک علوم کے تئیں منفی رجحانات کی غمازی کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنٹی فک نقطۂ نظر کی کمی اور نئے طریق کار کے بغیر ریسرچ کی دنیا اندھوں کی دنیا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں کوئی دوسرا طریقہ نہیں جس کے ذریعہ حقیقت کی تلاش کا کام جاری رہ سکتا ہے۔ KARL PEARSON اپنی کتاب GRAMMER OF SCIENE میں لکھتا ہے:

"THERE IS NOT SHORT CUT TO THE TRUTH — NO WAY TO GAIN KNOWLEDG[E] OF THE UNIVERSE EXCEPT THROUG[H] THE GATE WAY OF SCIENTIFIC METHOD.

سائنٹی فک طریقہ کار ایک خاص ضابطہ کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتا ہے۔ یہ ایک خاص طرز کی تلاش وجستجو کا نام ہے جس کے ذریعہ بہتر حقیقی علم حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے چند ARTICLS OF FAITH ہیں جن پر اس کی ساری اساس قائم ہے۔ ان کا جائزہ ضروری ہے:

1. RELIENCE ON EMFRICAL EVIDEN[CE]

2, USE OF RELEVANT CONCEPT

3, COMMITMENT OF OBJECTIVITT

4, ETHICAL NUTURALITY

5, GENARALITY

6, PREDICTION

آج کا فرد علم اور سائنس پر اعتماد اور یقین رکھتا ہے۔ وہ حقایق کو ان کی مدد سے ثابت کرتا ہے۔ وہ تمام اشیاء جو نہ کسی نہ کسی شکل میں حواس خمسہ کے ذریعہ محسوس کی جاتی ہیں۔ سائنس کی روشنی میں اپنا وجود محسوس کراتی ہیں۔ اس لیے سائنس داں یہ یقین کرتا ہے کہ اُس کے علم کا سرچشمہ DATA OF SENSES سے حاصل کیا ہوا تجربہ ہے

تصورات نظریات منطقی تعمیرات کی دُنیا ہیں۔ یہ تجربات اور احساسات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ تصورات دراصل علامتیں ہیں، جن کے ذریعہ سائنس کام کرتی ہے بلکہ یہ لسانی اوزار ہیں۔ سائنس کی زبان فطری مسائل پر غور و فکر کرنے کے لیے استنباط کرتی ہے۔ عام الفاظ اور زبان اُس کے لیے کافی نہیں ہوتی۔

سائنسی ضابطہ میں داخلیت کی کہیں گنجائش نہیں ہوتی۔ سائنس داں یہ یقین رکھتا ہے۔ اپنی منزل کے قریب پہنچنے کے لیے اُسے تمام اشیاء سے بلند ہونا چاہیے۔ لہٰذا بالکل معروضی رویّہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ معروضیت کے متعلق GALTING کہتا ہے کہ یہ دو چیزوں کا مرکب ہے۔

INTRA SUBJECTVITY

INTER SUBJECTIVITY اور

اخلاقی ضابطوں اور جانب داری کے سلسلہ میں FARADAY کا خیال ہے کہ اسکالر کو تمام افراد کی باتیں سننی چاہیے۔ لیکن فیصلہ خود اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق کرنا چاہیے۔ جس میں اخلاقی اقدار کے پہلو بھی پیش نظر ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ کائنات میں زبردست قسم کا ایک مربوط رشتہ قائم ہے۔ دُنیا میں کوئی سائنس مکمل نہیں ہو سکتی اگر اُسے کائنات میں ہم آہنگی کا یقین نہ ہو۔ اس لیے سائنٹفک طریقہ کار کا علم نہ صرف اُردو کے اسکالر اور نگراں کے لیے ضروری ہے بلکہ تمام اسکالرس کے لیے یہ واحد طریقہ کار ہے جس کے ذریعہ وہ حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

مواد کی صحت کی جانچ اور تجزیہ

گذشتہ صفحات میں مواد کی فراہمی کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی گئی تھی اب ان صفحات میں یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ اطلاعات اور مواد کی فراہمی کے بعد تحقیق کے سلسلہ میں ان سے کیا اور کس طرح کا کام لیا جانا چاہیے۔

مواد کی فراہمی کے بعد اسکالر کے دو اہم کام ہوتے ہیں:

۱۔ مواد کی تشریح و توضیح

۲۔ مواد کا سائنسی تجزیہ

مگر ان سے پہلے ان تمام مواد کو از سر نو ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ موضوع سے متعلق کام کی باتیں الگ ہو جائیں۔ انٹرویو اور سوال نامہ میں

چند غیر ضروری باتیں بھی آسکتی ہیں۔ اس طرح مشاہدات اور رویّوں کے مطالعہ
میں ایسے عناصر بھی شامل ہو سکتے ہیں جن کی ضرورت اسکالر کو نہیں ہوتی ہے۔
لیکن جنھیں اخلاقی طور پر شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے ضروری حصہ کو
PROCESSING کے ذریعہ الگ کر لیا جاتا ہے تاکہ تجزیہ کرتے وقت آسانی
ہو۔ ڈاٹا کے تجزیہ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ مفروضہ کی روشنی میں یا ریسرچ سے
متعلق پیدا ہونے والے سوالات کے پیش نظر یا وہ اُن نظریوں کی روشنی
میں جو موجودہ عہد میں تسلیم کیے جاتے ہیں یہ دیکھے کہ وہ واقعی ذمہ دار
حیثیت کے مالک ہیں یا نہیں۔ یعنی قابل آزمایش ہیں اور ان پر بھروسا
کیا جاسکتا ہے۔ مگر بہت سے مصنف جن میں SELLTIZ اور JAHODA
شامل ہیں اس فرق کو نہیں سراہتے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک DATA کا
تجزیہ PROCESSING میں شامل ہے۔ موضوع کی نوعیت کے اعتبار
سے DATA کے تجزیہ کا طریق کار بھی مختلف ہوگا۔ اگر واضح اور غیر مبہم
مفروضات کا مطالعہ کیا جارہا ہے تو یہ تجزیاتی اقدامات ضروری ہوں گے۔
مفروضہ جتنا واضح اور اہم ہوگا تجزیہ کا عمل اتنا ہی متحرک رہے گا۔
اس طرح کے مطالعہ میں تجزیہ تقریباً (MECHANICAL) میکنیکل ہوجاتا
ہے۔ اس لیے سماجی علوم میں تجزیہ کی یہ قسم نہ صرف نامقبول ہے بلکہ ناقابل عمل
بھی ہے۔ ادب میں تو اس کا اور بھی گزر نہیں۔ اس لیے DATA کا تجزیہ منطقی
طور پر کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے بھی وہ تکنیک استعمال کی جاتی ہے جو طریقہ کار
کے دوران سامنے آتی ہیں ان کا پہلے سے کوئی ضابطہ نہیں ہوتا۔

البتہ DATA کی تشریح و تفسیر اور اس کے تجزیہ کے درمیان کوئی
واضح خطِ امتیاز کھینچنا بہت دشوار کام ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو دونوں

ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ اگر تجزیہ کے ذریعہ ڈاٹا کو ایک خاص طریقہ سے منظم کیا جاتا ہے تو تشریح افہام وتفہیم کے مسئلہ کو حل کر دے گی۔ اگر تجزیہ کے بعد اسکالر خاص نتائج اخذ کرتا ہے تو اُن نتائج کی مزید تفسیر بیان کرنی ضروری ہے اور یہ کچھ الگ سے کوئی شئے نہیں ہے بلکہ اس کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ تشریح اس علم کو جاننے کا نام ہے۔ اس لیے تجزیہ بغیر تفسیر و توضیح کے ممکن نہیں۔

چونکہ ان دونوں میں ایک ربط باہمی ہے۔ اس لیے اسے تجزیہ کا ایک خاص پہلو بھی کہا جا سکتا ہے اور اس کے الگ وجود سے انحراف کا عمل غلط نہیں ہوگا۔ تھوڑی دیر کے لیے اگر اس کے علحدہ وجود کو مان لیا جائے تو اس عمل کے ذریعہ تحقیق کے نتائج کو سامنے لانے میں مدد ملتی ہے۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایسا عمل ہے جو مجرد کو حقیقت کی شکل دیتا ہے۔ نتائج سے وابستہ استفہامیہ صورت حال کا جواب دیتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تشریح و تجزیہ کو بالکل ہی ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی ریسرچ کی اعلیٰ ترین سطح ہوتی ہے اور یہیں نگراں اور اسکالر دونوں کے ذہنی معیار کا پتہ چلتا ہے۔ مگر ایک بات قابل غور ہے وہ یہ کہ سائنس اور ادب کے تجزیہ اور تشریح و تفسیر میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ تجزیہ اُس وقت تک شروع نہیں کرنا چاہئے جب تک ضروری مواد فراہم نہ کر لیا گیا ہو۔ تشریح و تجزیہ کے مسائل مطالعہ کی نوعیت سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کا ایک طائرانہ جائزہ اسکالر کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

ریسرچ کا کوئی موضوع ہو اس میں سوال نامہ، انٹرویو اور ایسے ہی دوسرے ذرائع سے حاصل کی گئی اطلاعات کا بڑا ذخیرہ ہوتا ہے۔ یہ زبانی بھی

ہو سکتا ہے اور تحریری بھی۔ اس لیے انھیں مختلف گروپ یا خانوں میں رکھ کر ہی کام کیا جا سکتا ہے۔ ایک سوال کے مختلف جوابات بھی ہو سکتے ہیں اس لیے یہ تقسیم کارآمد سمجھی جاتی ہے۔ مگر اسکالر کو اس تقسیم کے لیے کچھ اصول بنانے ضروری ہو جاتے ہیں۔ یہ اصول سوالنامہ اور انٹرویوز کی بنیادوں پر بنائے جا سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان میں موضوع اور مفروضات کی تمام خصوصیات آجاتی ہیں۔ گویا DATA جمع کرنے کے ذرائع کے اندر ہی تجزیاتی اصول پوشیدہ رہتے ہیں۔ ان کی حیثیت مواد اور ہئیت کی سی ہے۔ مواد کے اعتبار سے فن کار فارم کا انتخاب کرتا ہے۔ اسی طرح تجزیاتی اصولوں کے ساتھ یہ مثال صادق آتی ہے۔

دوسرا طریقہ منفی اور مثبت جوابات کے ذریعہ ہوگا۔ 'ہاں' اور 'نہیں' کے خانوں میں انھیں رکھ کر توضیح کی منزلیں طے کی جا سکتی ہیں۔ مگر اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ تقسیم اپنے اندر اتنی وسعت رکھے کہ ساری چیزیں سمٹ جائیں اور جوابات کی بنیادی باتیں ان گروپ میں رکھی جا سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی جواب محض اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ وہ کسی خانہ میں فٹ نہیں ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ کی آخری اہم چیز یہ ہے کہ ایک قسم دوسری پر حاوی نہ ہو جائے یا ایک جواب کئی خانوں میں رکھ دیا جائے۔ اس سے تجزیہ کے نتائج مبہم اور غیر حقیقی ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ سماجی علوم اور ادبیات کے ریسرچ میں اس طرح کی تقسیم بہت مشکل معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ تر ان کی حیثیت ملی جلی رہتی ہے۔ خاص کر شعر و ادب کی دنیا ایسی نہیں ہوتی کہ وہ نہیں قید خانوں میں مقید کر دیا جائے۔ یہ عمل بظاہر تکنیکی ہوگا۔ لیکن یہاں وہ فرق لطیف حائل ہے جو ادب کو سائنس اور سماجی علوم کی سائنس سے الگ رکھتا ہے۔ ہاں کسی قدر رویہ اور برتاؤ کے پیش نظر ہم ادب کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ تخلیقی

رویہ کے سلسلہ میں یہ بات زیادہ قابل فہم معلوم ہوتی ہے۔

سماجی علوم میں تجزیاتی طریقۂ کار جیسا کہ میں نے عرض کیا، ادب کی روایتی تنقید اور تحقیق کے تجزیہ سے الگ ہے۔ لیکن اب اس بات کی ضرورت ہے کہ سماجی علوم کے تجزیاتی طریقۂ کار سے استفادہ حاصل کیا جائے۔ مثلاً ایک شعر کے ذریعہ اس کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ فراق کا ایک بے حد مشہور شعر ہے ؎

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

بظاہر آسان اور مقبول عام شعر ہے۔ لیکن اس شعر کا تجزیہ سماجی شعور اور بصیرت کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اشعار کے معنوی حسن سے قطع نظر اس کے CONTENT ANALYSIS کے ذریعہ ہم اس شعر کی اہمیت کو مزید اُجاگر کر سکتے ہیں۔ اس طرح فیض کی شاعری یا کلاسکی شاعری سے مثالیں دے سکتے ہیں۔ غالب کے کلام سے صدہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اب الفاظ سواریوں کے مانند تصور کیے جاتے ہیں، جن کے ذریعہ شاعر اپنے تصورات اور خیالات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب شعر کی صفتوں تک تنقید محدود تھی اور بلاغت و عروض نے اپنے جال میں اُردو شاعری کی خصوصیات کو مقید کر دیا تھا۔ اب مختلف علوم سے استفادہ حاصل کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اس لیے غالب کا مطالعہ ان ہی موجودہ علمی تناظر میں کرنا ضروری ہے۔ اس لیے CONTENT ANALYSIS جو زیادہ تر سماجی علوم کے ریسرچ کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے ادبیات میں بھی اہمیت کا مستحق ہو گیا ہے۔ سماجی علوم میں خصوصیت سے علم نفسیات، بشریات،

سماجیات اور معاشیات کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے گہرا ہو گیا ہے
ان تمام علوم کا رشتہ عارضی یا لمحاتی نہیں ہے بلکہ ادب کو ان علوم نے اپنے
حصار میں رکھ لیا ہے۔ یہ شعر ہر افسانہ اور ہر تخلیقی کوشش کسی نہ کسی طرح ان
علوم کی روشنی میں تجزیہ اور تشریح کا مطالبہ کرتی ہے۔ لہٰذا ادبی ریسرچ کی
دُنیا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔

سماجی نفسیات کے شعبہ کے ماہرین دو وجہوں سے مواد کی خصوصیات کا
تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک افراد کی گفتگو اور اُن کا رویہ مطالعہ کی
خصوصی ریاضت چاہتا ہے۔ اس لیے وہ رویوں کو علامت کی شکل دیتے ہیں
اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ جدید ادب میں بھی ہمارے رویہ علامتوں کی شکل
میں نمودار ہو رہے ہیں۔ جدید شاعری اور جدید افسانہ نارمل اور ابنارمل
رویوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ رویہ صرف سماج کے مختلف طبقوں کے
افراد کا نہیں ہوتا بلکہ خود فن کار ان رویّوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس لیے
علم نفسیات نے جس تجزیاتی طریقۂ کار کا انتخاب کیا ہے وہ ایک حد تک ہماری
رہنمائی بھی کر سکتا ہے۔

خصوصیت سے افسانوی ادب پر کیا جانے والا ریسرچ اُس وقت تک
جدید اور سائنٹی فک نہیں ہوگا جب تک افسانوی کرداروں کے رویوں اور
برتاؤ کا تجزیہ نہیں کیا جائے۔ کیوں کہ ان کا بڑا حِصّہ جدید علوم کے لیے مطالعہ
بہم کرتا ہے۔ فکشن کا تجزیہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ
INTER DISCIPLINARY مطالعہ کی روشنی میں جائزہ نہ لیں۔ بعض افسانے
جن کی بنیاد سائنٹی فک فکشن پر ہے خصوصیت سے اس تجزیہ کے مستحق ہیں۔
"خُدا کی بستی میں" پاکستان کے ایک خاص دَور کے افراد کی آئینہ داری

صرف مہاجرین کے مسائل سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ مخصوص ذہنی اور سماجی رویوں کی بھی آئینہ داری کرتی ہے۔ اسی طرح "خوں بہا" کی حیثیت اور انقلابی انتہا پسندی کا تجزیہ بھی موجودہ معاشرہ کے مختلف رویوں کے تجزیہ کے ذریعہ ہی ناقدوں کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ جن سے ہمارے اُردو ادب کے اکثر ناقد ناآشنا ہیں یا جنھیں جاننا ضروری نہیں سمجھتے۔

علم نفسیات نے سوال ناموں کے ذریعہ اُردو کے ریسرچ اسکالر اور نگراں کو تحقیق کا ایک نیا شعور عطا کیا ہے۔ انٹرویو، سوال ناموں اور رویوں کے مشاہدات کے ذریعہ وہ اعلیٰ ادبی تحقیق کے اصول وضع کر سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ وہ اقدار شناسی اور مطالعہ کی ضرورت پر ایمان لے آئیں۔

تجزیہ کے سلسلہ میں ہر مصنف کی اپنی رائے ہوتی ہے اور اُس کے اصول مواد کی فراہمی سے خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ لیکن مواد کو خانوں میں تقسیم کرنے کا عمل بھی بعضوں کے نزدیک تجزیہ کی ایک منزل ہے LEON FESTINGE کا خیال ہے۔

"THE PROCESS OF CLASSIFICATION INTO CATEGORIES IS COMONONLY KNOWN AS CONTENT ANALYSIS."

لیکن CONTENT ANALYSIS کی سب سے اچھی تعریف BERELSON نے اس طرح کی ہے:

"CONTENT ANALYSIS IS A RESEARCH TECHNIQUE, FOR THE OBJECTIVE, SYSTEMATIC, AND QUANTITATIVE

DISCRIPTION OF THE MANIFEST CONTENT OF COMMUNICATION,

BERELSON نے ہی زبانی مواد کے تقریباً ۱۶ طرح سے CONTENT ANALYSIS کے طریقہ کو استعمال کیا ہے۔ اس نے ایک نظام ہی بنا دیا ہے جس کے ذریعہ مواد کی تقسیم ممکن ہو سکی۔

وہ مواد جن کی حیثیت علامتی ہے اُن کے لیے BERELSON نے تین طریقے بتائے ہیں:

(۱) اسکالر بنیادی طور پر مواد کی خصوصیات میں دل چسپی لیتا ہے۔

(۲) دوسرے مرحلہ میں اسکالر مواد کی خصوصیات کو اُجاگر کرنے والے افراد کی نوعیت کی واقفیت حاصل کرتا ہے۔

(۳) وہ مواد کی اس طرح تشریح کرتا ہے جس سے اس کی واضح شکلیں سامنے آسکیں۔

ان کے ذریعہ مواد کی ہئیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس طرح وقت گزر جانے کے بعد جب مواد میں بنیادی تبدیلی آجاتی ہے تو پھر سے ریسرچ کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ ریسرچ کے طریقۂ کار کے ماہرین نے بین الاقوامی سطح پر بھی C.A. (CONTENT ANALYSIS) کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مختلف علوم میں ان کی نوعیت یکساں نہیں ہے۔ مثلاً دوسری جنگ عظیم کے دوران مختلف ممالک میں بڑے لیڈروں اور فوجی افسروں کے بیانات کا خاص مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اب تو باضابطہ ایک بڑے دفتر میں یہ کام ہوتا ہے جہاں صرف خارجی

پالیسی کی وضاحت اور تشریح و تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے پروپیگنڈا جو موجودہ صدی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اُس کی طرف باضابطہ دھیان دیا جاتا ہے اور نہایت محنت، ذہانت اور سنجیدگی کے ساتھ تجزیاتی طریقۂ کار کو اختیار کیا گیا تاکہ اندرون ملک اور بیرون ملک کی سیاسی حکمت عملی کو سمجھا جا سکے۔ اور تمام ضروری اطلاعات حاصل ہو سکیں۔ اس لیے سماجی سائنس میں اس کی اہمیت محسوس کی جاتی ہے۔ اس کے ذریعہ فوجی اطلاعات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ ادبیات میں اس طرح کا تجزیہ ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

HART نے اس طریقۂ کار کے ذریعہ امریکہ میں ۱۹۳۰-1900 ملک کی آبادی کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ رویوں، عادتوں کا مطالعہ بھی تھا، مشاہدات بھی شامل تھے اور DATA جمع کرنے کے تمام ذرائع کو استعمال کیا گیا تھا۔ جب تمام مواد کا ذخیرہ جمع ہو گیا تو HART اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس عرصہ میں امریکہ میں جنسی آزادی بڑھی ہے اور لوگوں میں PERMESSIVE سوسائٹی کا رجحان مقبول ہوا ہے اور مذہب کی مقبولیت میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اس طرح فلموں کا سنجیدہ مطالعہ کرنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ وہ کسی ملک کے عوام کا DAY DREAM ہے۔ یہاں تجزیہ کی نوعیت کلچرل ہے۔ اس طرح ادب کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

پھر ادبی ریسرچ کے دوران چوں کہ رویوں کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس لیے تجزیاتی طریقۂ کار کو اختیار کیے بغیر نتائج سامنے نہیں آ سکتے۔ جنگِ آزادی کے دوران کے اردو ادب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو وطن کی محبت، قربانی کا جذبہ، آزادی کی لگن وغیرہ ایسے عناصر ہیں جن کی حیثیت بنیادی طور پر اہم ہوگی۔ اب ہر صنف کی جداگانہ تشریح، مطالعہ اور جائزہ

مخصوص تناظر میں ہو تو تجزیہ کی اہمیت کا احساس ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ادبیات سے سائنس تک اس طریقۂ کار نے مقبولیت حاصل کر لی ہے اور اس تکنیک کو ہم اپنے ادب کی دنیا میں بھی بخوبی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ریسرچ کا مقالہ صرف الفاظ کی کھتونی نہیں ہوگا بلکہ سائنٹی فک طریقہ کار کے ذریعہ تلاشِ حقیقت اور تلاشِ حُسن کی کامیاب کوشش ہوگی۔

CONTENT ANALYSIS کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ افراد کے علامتی رویوں کو سائنٹی فک ڈاٹا میں بدل دیا جائے۔ اس میں حسب ذیل خوبیاں ہونی چاہئے :-

(۱) واقعیت پسندی کے ساتھ ساتھ دوبارہ پیش کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔

(۲) تاثر کا مادہ یا صلاحیت کا وجود ہونا چاہیے۔

(۳) باضابطہ نظریوں کی اہمیت ہو۔

(۴) ایسا کُلیہ ہو جو کم مثالوں پر قائم کیا گیا ہو۔

باب چہارم

تحقیق کے طریقۂ کار

مشاہدات ریسرچ کے طریقۂ کار کے ماہرین نے DATA جمع کرنے کے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ سارے طریقے ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ اس لیے ان کا تقابلی مطالعہ مفید ہے۔ FRESTENGER KARTZ نے تین امور کی طرف اسکالر کی توجہ مبذول کی ہے :-

(۱) سوال ناموں کے ذریعہ

(۲) افراد کے مشاہدات کے ذریعہ

(۳) ماضی میں جمع کیے گئے ڈاٹا کے مطالعہ کے ذریعہ

سماجی نفسیات میں DATA جمع کرنے کے طریقوں پر بہت زور دیا گیا ہے اور معروضی مشاہدات کے مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تمام ریسرچ اسکالرس کے مشاہدہ کے طریقے الگ ہیں۔ بعض نے سوال نامہ کی افادیت پر زور دیا ہے، بعض نے انٹرویوز پر۔ لیکن کسی نے بھی ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا۔ یہ سارے ذرائع ادب میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ خصوصیت سے انٹرویوز اور سوال نامہ۔ لہٰذا ان کے متعلق تفصیل سے

جاننا ضروری ہے کہ آخر انٹرویوز کیا ہیں۔ اُن کی اہمیت کیوں ہے اور اُن سے حاصل کیے گئے حقائق سے کس طرح نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس طرح جب ہم مشاہدہ کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں اس کا احساس رہتا ہے کہ ہم لوگ ہر وقت، ہر لمحہ مشاہدہ کی مختلف منزلوں سے گزرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام مشاہدات سائنٹی فک نہیں ہوتے۔ ہمہ اقسام کے DATA جس کی ضرورت اسکالر کو ہوتی ہے، وہ صرف براہ راست مشاہدہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح کے مشاہدے سے بہت سے فوائد ہیں۔ ان مشاہدوں کی قسمیں بھی کئی ہیں۔

CONTROLLED / UNCONTROLLED OBSERVATION

STRUCTURED / UNSTRUCTURED OBSERVATION

PARTIALLY STRUCTURED PARTICIPANT / NON PARTICIPANT

DISGUISED OBSERVATION

مشاہدہ کی مذکورہ بالا قسموں کا استعمال اس امر پر منحصر ہے کہ اسکالر کا موضوع کیا ہے اور اس کے کام کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اس کی تحقیق کے مقاصد کیا ہیں۔ اگر کسی حقیقت کی تلاش کا مسئلہ درپیش ہے تو مشاہدہ کا طریقہ قدرے UNSTRUCTURED ہوگا اور مشاہدہ کرنے والا جماعت یا گروپ میں شامل ہوگا صرف تماشائی کی حیثیت نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اگر مطالعہ کی نوعیت وضاحتی یا تجرباتی ہے تو مشاہدہ کا طریقہ STRUCTURED ہوگا اور اس میں مشاہدہ کرنے والے کی شمولیت گروپ اور حلقہ سے ضروری نہیں ہے۔ لیکن مشاہدہ کرنے والے کا ذہن کم از کم چار طرح کے سوالوں کے سلسلے میں

بالکل واضح ہونا چاہیے:

(۱) کس کا مشاہدہ کرنا ہے۔

(۲) مشاہدات کی تحریری نوعیت کیسی ہوگی۔

(۳) مشاہدات کی صحت کی ضمانت کیا ہے۔

(۴) مشاہدہ کرنے والے اور مشاہدہ کے درمیان قربت کیسی ہوگی اور ان میں یہ قربت اگر نہیں ہے تو کیسے قائم کی جائے گی۔

مشاہدات کے ان چار طریقوں کا علم بھی ضروری ہے UNSTRUCTURED مشاہدہ مرکب ساخت STRUCTURED کے برعکس ہے۔ کیوں کہ STRUCTURED مشاہدہ میں اشیاء کی حد بندی اور تعریف متعین کردی جاتی ہے۔ اطلاعات کو ریکارڈ کرلیا جاتا ہے لیکن UNSTRUCTURED میں یہ سب نہیں ہوتا۔ اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ مشاہدہ کس کا کیا جائے۔ کیوں کہ اس کی وضاحت نہیں ہوئی تو DATA جمع کرنا بھی مشکل ہے اور اس کے نتائج کا معلوم کرنا بھی دشوار۔ وہ ریسرچ جس کے اغراض و مقاصد اور طریقۂ کار میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی اور جس کا مفروضہ واضح ہوتا ہے وہ یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اُس کے لیے کس طرح کے DATA کی ضرورت ہوگی اور کس طرح حاصل کیے جائیں گے۔

لیکن وہ ریسرچ جس میں حقیقت کی تلاش کا تصور واضح نہیں رہتا اُسے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہ کن راہوں سے گزرے گا۔ عام طور پر اس کے لیے کوئی اصول وضع نہیں کیے گئے ہیں۔ لیکن چند اشارے ضرور ملتے ہیں۔ مثلاً

(۱) ناظر کو یہ دیکھنا چاہیے کہ شرکار کی نوعیت کیا ہے۔ اُن کی تعداد

کتنی ہے اور اُن کے آپسی تعلقات کیسے ہیں۔

(۲) مشاہدہ کرنے والے کو یہ جاننا چاہیے کہ ساخت یا ترتیب کیسی ہوگی، وہ کس طرح اپنے ناظرین کو اپنے مصرف کی خاطر استعمال کر سکتا ہے۔

(۳) اُس میں حصّہ لینے والوں کی جماعت کے مقصد کو بھی سمجھنا چاہیے جس نے لوگوں کو جمع کیا ہے۔ مقاصد کیسے ہیں اور اس سے افراد کس طرح اپنا رشتہ محسوس کرتے ہیں۔

(۴) معائنہ کرنے والے کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ شریک ہونے والے افراد کی مصروفیات کیا ہیں۔ اُن کی خصوصیات کیا ہیں۔ وہ کس کے درمیان کام کرتے ہیں اور کام کرنے والوں سے ان کے تعلقات کیسے ہیں۔ اُسے اس کی بھی جانکاری ہونی چاہیے کہ افراد کے مجمع فعل STIMULS رویوں کو کس طرح ظاہر کرتے ہیں۔ اور بعض رویوں کا مقصد کے حصول سے کیا تعلق ہے۔

اب ان مشاہدات کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے دو بنیادی باتیں قابل غور ہوتی ہیں:۔

(الف) انھیں کب اندراج کرنا چاہیے۔

(ب) اُسے کس طرح بحفاظت رکھنا چاہیے۔

سب سے عمدہ اور عملی صورت یہ ہے کہ وقت معینہ پر ہی مشاہدات کو رقم کرنا چاہیے۔ اس طرح تعصبات سے آدمی فطری طور پر بچ جاتا ہے اور یادداشت کی کمزوریوں سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ مگر اس کے سلسلہ میں بعض لوگوں کا

خیال ہے کہ ایسا کرنے سے فطری تعلقات کو نقصان پہنچتا ہے اور عموماً ایسا کرنا
بروقت ممکن بھی نہیں۔ اور جن لوگوں کے رویوں کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے اُن
کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ حقیقت کو چھپانے کی
کوشش کرتے ہیں یا پھر اُن سے اجتناب کرنے لگتے ہیں۔ پھر سوال وجواب کے
دوران تحریری کارروائی اور مشاہدات کا ساتھ ساتھ چلنا آسان نہیں ہوتا۔
یا تو توجہ میں کمی ہوگی یا تحریری کمزوریاں پیدا ہوں گی۔ اس طرح ذہن مختلف
کاموں میں بٹ کر رہ جائے گا اور اسکالر پریشان ہو جائے گا۔ مگر اس کی
دوسری صورت بھی دشوار اور غلطیوں کے امکانات سے خالی نہیں۔ اگر بروقت
احاطہ تحریر میں مشاہدات کو نہیں لایا گیا تو ساری باتیں یادداشت سے لکھنی
پڑیں گی۔ اس لیے بہتر صورت یہ ہے کہ دوران مشاہدہ اہم نکات کو بے حد
اختصار کے ساتھ اسکالر لکھتا جائے لیکن اُس کا یہ عمل ایسا ہونا چاہیے کہ
مخاطب کی طرف برابر دھیان رہے اُس کی توجہ میں کوئی کمی نہ ہو اور دلوں
میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو نکالنے کا کام بھی جاری رہے۔ اگر
اسکالر INDEXING SYSTEM سے واقف ہے تو اُسے
اہم نکات کو لکھنے میں مشکل نہیں ہوگی۔ اس طرح جو افراد اُس کی آنکھوں کے
سامنے ہیں اُن کی بھی توجہ برقرار رہے گی اور وہ بھی مسائل میں دلچسپی لیتے
رہیں گے۔

مشاہدات کی صحت اسکالر کا دوسرا اہم مسئلہ ہے۔ اگر کہیں بروقت
نکات کو ضبطِ تحریر میں لانا مشکل ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ تنہائی میں اُنھیں
لکھتے وقت مشاہدات کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے تو اُسے TAPE RECORDING
سے مدد لینی چاہیے۔ یہاں ریسرچ کے لیے TOOLS اور آلات کی

ضرورت ہوتی ہے ویسے اسکالر کو اپنے حواس خمسہ کو بیدار رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ کام اس کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اسکالر اس کام کے لیے کئی افراد کو بحال کرلے تو مشاہدات کی صحت کا مسئلہ آسان ہو جائے گا۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ کوئی کیوں کسی کا کام کرے گا۔ پھر اگر کوئی تیار بھی ہو جائے تو ضروری نہیں کہ اُس کی ذہنی سطح بھی اسکالر کے برابر ہو گی اور وہ بھی احاطہ تحریر میں وہی لکھے گا جو اسکالر محسوس کرتا ہے۔ دو آدمی بھی اس کام کو بخوبی انجام نہیں دے سکتے۔

اس کام کے سلسلہ میں ذاتی مصلحت اندیشی اور داخلیت پسندی نقصان پہنچاتی ہیں۔ وہ اگر کسی شخصیت سے متاثر ہے یا مرعوب ہے تو اُس کے مشاہدات کا دائرہ محدود ہو گا اور افراد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور افعال کی طرف اُس کی نظر نہیں اُٹھے گی۔ اس لیے ہر لحہ اُسے اپنے کاموں کا تنقیدی جائزہ لیتے رہنا ہو گا یعنی اسکالر کے لیے یہ منزل خود احتسابی کی منزل ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے مشاہدات اور رویوں کے مطالعہ کے لیے وہ جاتا ہے اُن سے اسکالر کو ایک ربط پیدا کرنا ضروری ہے۔ بہت سے لوگ، حقایق کے اشتہار کی وجہ سے اطلاعات بہم نہیں کرتے اور اپنا رویہ ظاہر نہیں ہونے دیتے، یہ اسکالر کے لیے پریشانی کی بات ہے۔ اس لیے یا تو اُن کا دل جیتنے کی کوشش کرنی چاہیے یا اُن کا اعتماد حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ یا پھر اپنی شخصیت اور اغراض و مقاصد کو پوشیدہ رکھنا چاہیے تاکہ افراد بغیر کسی شک و شبہ کے اہم نکات کی نشان دہی کر سکیں۔ رویوں کے مطالعہ میں اسکالر کا محتاط رویہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ آدمی کئی چیزوں کے ساتھ زندہ رہتا ہے حسب ضرورت وہ نقاب بدلتا رہتا ہے۔ یہ اس کی بڑی نفسیاتی کمزوری ہے۔

لہٰذا اسکالر کو علم نفسیات کے اصولوں کا علم ہونا چاہیئے۔ اُسے انسانی نفسیات کا تجربہ بھی درکار ہے۔ اس طرح ریسرچ کا یہ عمل سماجی نفسیات کے دائرہ میں آجاتا ہے اور ادبی تحقیق بھی اس سے بیگانہ نہیں رہ سکتی۔ ایک طریقہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر بہت سے افراد کے رویوں کا مطالعہ مقصود ہو، اور اسکالر کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ ان سے ملنے میں کامیاب نہیں ہوگا تو اس جماعت کے ایک دو ذمہ دار نمایندہ افراد کو اپنی مشکلیں بتائے، اپنے مقاصد کو واضح کرے اور اُن کی مدد سے رویوں کا مطالعہ کرے۔

STRUCTURED مشاہدات' اطلاعات کی تقسیم غور و فکر کے بعد کرتی ہے۔ اس کے اغراض معین ہوتے ہیں، اطلاعات پہلے سے طے کرلی جاتی ہیں۔ اس طریقۂ کار کا استعمال وہاں ہوتا ہے' جہاں باقاعدہ کسی مفروضہ کو تجربات کے ذریعہ سچ بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہاں اسکالر کے سامنے ساری چیزیں واضح رہتی ہیں۔ وہ خاص تکنیک اور پلان کے ذریعہ ان کا مطالعہ کرتا ہے تب DATA جمع کرتا ہے۔ تجربہ گاہوں کو اس کو بڑی ضرورت ہوتی ہے ویسے R. F. BABS نے اس کے بارہ طریقۂ کار بتائے ہیں' جن کے ذریعہ رویوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

STRUCTURED مشاہدوں کو لکھنے کے سلسلہ میں۔ DUPLICA-TED SHEETS۔ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں وہ لسٹ شامل رہتی ہے جس کی کوڈنگ کرنی ہے۔ بعض مطالعہ ریسرچ میں MECHANICAL RECORDING INSTROMENTS استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثال کے لیے CHAPPLE نے INTERACTIONAL CHRONO-GRAPH۔ نکالا۔

AUDIO - INTROSPECTOMETER نے HELEN INTERACTIONAL نے GERBANDS اور BABS RECORDER بنائے ہیں۔ ان تمام اشیا کے ذریعہ رویوں کا ڈاٹا تحریر کیا جاتا ہے اور یہ کام ایک خاص ترتیب کے ساتھ طے پاتا ہے۔ اسی طرح MOTION PICTURES اور SOUND RECORDING کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے ذریعہ بہت سی معلومات آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہر فرد کے متعلق اطلاعات اور اس کے رویوں کا مطالعہ ممکن نہیں۔ اس کی ضرورت وہیں ہوتی ہے جہاں آبادی کا بڑا حصہ ہو، یا کسی مخصوص جماعت کے رویوں کا مطالعہ درکار ہو۔

مگر ان تمام باتوں کے لیے جس خصوصیت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ اسکالر کی تربیت ہے۔ اگر اسکالر ریسرچ کے طریقۂ کار سے بالکل ہی ناآشنا ہے اور اس کے نگراں کا بھی وہی حال ہے (جیسا کہ اردو کے اکثر اساتذہ کرام کا ہے) تو نہ وہ رویوں کا مطالعہ کر سکے گا، نہ اُن ٹولس سے مدد لے سکے گا جس کا ذکر کیا گیا، نہ افراد سے تعلقات قائم کر پائے گا صرف اپنی یادداشت اور وہ بھی یادداشت کے کمزور ترین حصہ پر ریسرچ مکمل کر لے گا۔ اردو میں اسے ڈگری مل جائے گی لیکن ریسرچ کے طریقہ کار کے تحت اُس کا کام انتہائی مہمل اور غیر سائنسی ہو گا۔

اسی لیے میں نے اس کتاب کے شروع کے حصہ میں نگراں کے فرائض سے متعلق چند اہم باتیں لکھی ہیں اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ اُردو کے اساتذہ کرام کے لیے ایک ریفریشر کورس تیار کیا جائے اور تحقیق کے طریقۂ کار سے واقفیت کرائی جائے۔

PARTICIPANT AND THE NON PARTICI-
PANT OBSERVATION ۔ یہ تصور سماجی علوم میں پروفیسر EDWARD LINDON نے دیا۔ موصوف اسکالر کے سوال ناموں کے طریقوں سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ ہاں اور نہیں کے جوابات سے یہ نہیں تسلیم کرتے کہ اس میں اسکالر یا افراد کے تعلقات شامل نہیں رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کسی شخص کے رویوں کا مشاہدہ مقصود ہو تو اُن سے سوالات نہیں پوچھئے بلکہ خاموشی کے ساتھ اُن کا مطالعہ کیجیے۔ اس کی مثال NELS ANDERSON نے HOBOS کے ساتھ رہ کر دی ہے۔ ہم قبائلی زندگی کے رویوں کے مطالعہ اور مشاہدوں کے لیے سوالات پوچھ کر کے اپنا مقصد پورا نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ہم اُن کی زندگی کے سفر میں مثل ایک راہی کے ہوں تو رویوں اور مشاہدوں کی نوعیت بڑی سچی ہوگی۔ وہ کسی ایک جماعت یا قبیلہ کی زندگی کے رویوں کا مطالعہ بہتر صورت میں اُسی وقت کر سکتا ہے جب وہ ان کی روزانہ کی زندگی کا ایک جزو ہو۔

اس کی دوسری اچھی مثال W. F. WHYTE نے دی ہے۔ جس نے اپنے مطالعہ کے دوران THE STREET CORNER SOCIETY لکھی۔ پھر PAUL CRESSY نے TAXI DANCE HALL میں اسی شرکت اور قربت کے ساتھ مطالعہ کیا۔

NON PARTICIPANT OBSERVATION اس کے برعکس ہے۔ یہ قبیلہ، جماعت یا افراد کے ساتھ رہنے یا خاموش مطالعہ کی بات نہیں کہتا۔ بلکہ اس طرح کی شرکت سے وہ بے نیاز رہتا ہے۔ ان دونوں طریقوں کے اپنے اپنے فوائد ہیں۔ جب اسکالر کسی جماعت یا خاندان یا قبیلہ کے اتنا نزدیک

آجاتا ہے کہ بقول JOHN MADGE ایک دوسرے کی دھڑکن بھی سُن سکتا ہے تو وہ بہت آسانی سے مختلف اوقات میں انسانی زندگی کی پیچیدگی کا مطالعہ کرسکتا ہے۔ اس وقت رویوں کا مطالعہ زیادہ آسان ہوجاتا ہے۔ وہ زندگی کی چھوٹی بڑی خبروں کے مشاہدہ کے ذریعہ کردار کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ جماعت، افراد یا قبیلوں کی خصوصیات واضح ہوجاتی ہیں۔ اُس کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے سوالات بلا خوف وخطر اپنے جوابات چاہتے ہیں اور جواب دینے والا ایمان داری کے ساتھ بغیر جھجک اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔ کیوں کہ ان کے درمیان کی اجنبیت ختم ہوجاتی ہے۔ دوسرا بڑا فائدہ اس شرکت سے یہ ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں جو افراد کبھی نہیں بتاتے، یا خاص موقع پر اپنے خصوصی رویہ سے محتاط رہتے ہیں وہ قربت کی وجہ سے منظرِ عام پر آجاتے ہیں۔ اس طرح اسکالر ان کے دلوں میں چھپی ہوئی باتوں کو جان لیتا ہے۔ مختلف موقع پر اُن کی زندگی میں اختیار کیے جانے والے موقف سے شناسائی ہوجاتی ہے اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ DATA جمع کرکے ہی کامیاب ہوجاتا ہے۔ وہ بغیر دشواری کے انھیں نوٹ کر لیتا ہے۔ اُسے اپنی یادداشت کی مدد بھی نہیں لینی پڑتی اور ایک ہی وقت میں ریکارڈ اور مشاہدہ عمل سے بھی محفوظ رہ جاتا ہے۔ اس طرح اُس کا حاصل کیا ہوا ڈاٹا کمزوریوں اور خامیوں سے بھرا ہوتا ہے۔

اس کا کمزور رُخ یہ ہے کہ جب اسکالر کسی خاص جماعت یا افراد کا ایک رکن بن جاتا ہے تو وہ غیر جانب دار نہیں رہ پاتا۔ اس طرح اس کی تنقیدی نظر بھی محدود ہوجاتی ہے اور حقائق کی قلم بندی میں وہ تغافل اور مروت کو راہ دیتا ہے۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ جذباتی تعلق کی وجہ سے

قابل اعتراض رویوں کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ اس طرح جب وہ مقالہ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کا مقالہ ایک حد تک غیر سائنسی رویہ سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اس لیے دونوں صورتوں میں سب سے بہتر راہ اعتدال و توازن کی ہے۔ اگر اسکالر اس کو اختیار کرلے تو دونوں قسموں کی اعلیٰ خصوصیتیں اس کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔

ان باتوں کے باوجود یہ تسلیم کر لینے میں تامل نہیں کرنا چاہیے کہ ایک غیر جانب دارمطالعہ کا کام خاصا دشوار ہے اور انھیں دشواریوں کا ذکر پہلی بار HERBERT SPENCER نے اپنی تخلیق STUDY OF SOCIOLOGY میں کیا ہے۔ اس نے اس موضوع پر چار ابواب لکھے ہیں اور ان اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی وجہ سے غیر جانب دارانہ مطالعہ نہیں ہو پاتا۔

(۱) ہمارے حواس خمسہ کی کمزوریاں

(۲) مشاہدہ اور اس سے حاصل کیے گئے نتائج کے انحصار کی فطری کمزوریاں۔

(۳) انسانی رویوں کا مطالعہ اس لیے بھی سو فیصدی درست نہیں نظر آتا کیوں کہ وہ عام لوگوں سے متاثر ہوتا ہے اور وہ دوسرے کو متاثر کرتا ہے۔

عام طور سے ہم لوگ اپنے حواس خمسہ کو معتبر سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ بات ایسی نہیں ہے۔ یہ ہماری خوش فہمی ہے۔ ہم اُن پر بھروسا ضرور کر سکتے ہیں لیکن ان کی حدیں ہوتی ہیں اور علم حیاتین نے ان حدوں کو مقرر کیا ہے۔ آنکھیں ایک خاص دوری تک دیکھ سکتی ہیں۔ کان کی قوتِ سامعہ محدود ہے۔ زبان

ذائقہ محسوسات کے ذریعہ حاصل کرتی ہیں۔ ذہن کے پرواز کی بھی حد ہے۔
ہاں یہ ضرور ہے کہ تمام افراد میں یہ صلاحتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ نفسیات
کے ماہرین نے اپنے ریسرچ کے دوران یہ محسوس کیا ہے کہ انسان کسی خاص واقعہ
کو خاص پس منظر میں ہی دیکھتا ہے اور یاد رکھتا ہے اور اس کی یادداشت
کا سارا عمل اُس کے ذہن کی ساخت اور جسمانی صحت پر مبنی ہے۔

اسی طرح مشاہدات اور ماخذ میں قریبی رشتہ ہے ایک دوسرے کو جدا
کرنا مشکل ہے۔ کوئی بھی شے جس کا تصادم ہماری قوت مدرکہ سے ہو، ہمارے
لیے اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا علم ہمیں ہوتا ہے اور ایسا کوئی تجربہ نہیں جس کا علم
ہمارے حواس خمسہ کو نہ ہو۔ ریسرچ اسکالر اس حقیقت کے باوجود دیکھتا
اور محسوس بہت کچھ کرتا ہے لیکن لکھتا بہت کم ہے۔ کیوں کہ اس کے پاس ایک
خاکہ پہلے سے موجود رہتا ہے جس میں بہت گھٹانا بڑھانا مشکل معلوم ہوتا ہے
اس سے نجات کی یہی صورت ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مشاہدات کا بہ غور مطالعہ
کیا جائے اُسے احاطۂ تحریر میں لایا جائے اور پھر مفید چیزوں کو آنے والے
اسکالرس کے لیے چھوڑ دیا جائے کیوں کہ ریسرچ پہلا اور آخری سبق نہیں ہے۔

انٹرویو

ادبیات میں عام طور سے بیانیہ یعنی زبان سے ادا کی گئی
باتوں کو اہمیت کم دی جاتی ہے اور تحریر میں زیادہ اہمیت
رکھتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے محقق ادب کے سلسلہ میں تحریری
بیانات اور مسودہ کو زیادہ قابل اعتماد درست اور بنیادی سمجھتے ہیں، اور
زبانی باتوں اور گفتگو جن کی کوئی تحریری شکل موجود نہیں رہتی ضمنی تصور کرتے ہیں۔

اگر کسی فرد کے بیان اور تحریر میں کوئی تضاد ہو تو لوگ تحریری بیان کو زیادہ لائق اعتبار سمجھتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی روایت بن گئی ہے اور دنیا کے تمام ادب میں عام طور سے تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے اور نہ اسے کلیہ تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ اعتراف کرنا آسان ہے کہ آدمی اپنی تحریروں میں غلط بیانی اور مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیتا۔ بہرحال انٹرویو ایک زبانی طریقۂ کار ہے۔ اس کے ذریعہ بھی DATA جمع کیا جاتا ہے۔

آدمی کے خیالات، نظریات اور عقاید کو سمجھنے کے لیے انٹرویو ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے موثر طور پر ساری اطلاعات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

G.W. ALLPORT نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے:

" IF YOU WANT TO KNOW HOW PEOPLE FEEL, WHAT THEY EXPERIENCE AND WHAT THEY REMEMBER, WHAT THEIR EMOTIONS AND MOTIVES ARE LIKE, AND THE REASONS FOR ACTING AS THEY DO — WHY NOT ASK THEM?"

(C.F. SELTIZ, JAHODA)

انٹرویو میں اسکالر سوالوں کا آغاز کرتا ہے اور دوسرا شخص جس کا انٹرویو لیا جاتا ہے جواب دیتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دورانِ گفتگو انٹرویو کرنے والا ضمنی سوالات بھی کرتا جاتا ہے اور اس استفسار سے مزید جوابات کی گنجائش نکلتی رہتی ہے۔ یہ بہت ہی عام تکنیک ہے لیکن اس میں مغالطے کی بھی

گنجائش ہوتی ہے۔ ویسے سماجی سائنس میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ماہرین سماجیات اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ نظریاتی مباحث اور عقیدوں کی چھان بین کے لیے یہ بہت مؤثر ذریعہ ہے۔

انٹرویو کی تکنیک جس کا ذکر اس باب میں کیا جا رہا ہے DATA جمع کرنے کا زبانی وسیلہ ہے۔ دوسرا مؤثر طریقہ سوال نامہ کا ہے جس کی تفصیلات بعد میں آئے گی۔ دونوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک اطلاعات کی فراہمی زبانی ذریعہ سے حاصل کرتا ہے اور دوسرا تحریری، جو زیادہ تر مراسلات کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ چونکہ رویوں کے مطالعہ اور مشاہدہ کے ذریعہ بہت سی باتیں صاف نہیں ہوتیں اس لیے DATA جمع کرکے دوسرے ذرائع کی طرف محققین کی توجہ مبذول ہوئی۔

انٹرویو عام طور سے دو آدمیوں یا اس سے زیادہ افراد کے سامنے ہوتا ہے۔ اس کا انحصار موضوع کی نوعیت پر ہے۔ اس میں ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے نکتہ کی وضاحت اسکالر کو فوراً ہو جاتی ہے۔ ایک جواب سے اگر اُس کی تشفی نہیں ہوتی تو وہ اپنی بات کو پھر سے پوچھ سکتا ہے۔ چونکہ انٹرویو لینے والا سوالوں کی ابتدا کرتا ہے اس لیے اُسے بے حد محتاط رہنا پڑتا ہے اور اس کا ہر وقت خیال رکھنا ہوتا ہے کہ انٹرویو دینے والے کو اُس کی کوئی بات بُری نہیں لگے۔ اس سے نجی زندگی کا دلچسپ خاکہ تیار ہو جاتا ہے اُس کی اندرونی زندگی میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے جوابات کی روشنی میں فرد کی ذہنی حالت اور نظریاتی تعصبات کا بھی پتہ چلتا ہے، اس لیے اسے EMPIRICAL طریقہ مطالعہ میں کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔

THE POLISH نے THOMOS AND ZNANEICKI

PEASANT لکھتے وقت اس انٹرویوز کے ذریعہ ایک سماجی اور معاشرتی نظام میں سانس لینے والے پولش عوام کے نظریات اور خیالات کی واقفیت حاصل کی تھی۔ چند اہم انٹرویوز کی تاریخ میں "THE AUTHORITARIAN PERSONALITY" کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس میں ADORNO اور اس کے رفقائے کرام نے بڑی محنت سے DATA کو جمع کیا اور نتائج معلوم کیے۔ اسی طرح STOUFFER نے THE AMERICAN SOLDIER میں بغور اس کا جائزہ لیا اور مدد لی۔ عام طور سے یہ تکنیک بہت مقبول ہے اور دوسری تکنیک کی بہ نسبت DATA جمع کرنے کا آسان طریقہ بھی ہے۔ اس لیے ادب کے ساتھ ساتھ سماجی علوم میں بھی اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ خصوصیت سے نفسیات اور سماجیات کے دائرہ میں اس کی خاصی قدر و قیمت ہے۔ ہم لوگ عام طور سے انٹرویو کے فائدہ سے تو واقف ہیں لیکن بہت کم اسکالر کو اس کا علم ہے کہ انٹرویوز بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں، مثلاً

(1) DIAGONOSTIC INTERVIEW

(2) PSYCHAITRIC INTERVIEW

(3) INDIVIDUAL INTERVIEW

(4) GROUP INTERVIEW

(5) THERAPEUTIC INTERVIEW

(6) STRUCTURED OR UNSTRUCTURED INTERVIEW

(7) DIRECTIVE OR UNDIRECTIVE INTERVIEW

انٹرویو کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ مفروضات کو ثابت کرے۔ دراصل انٹرویو، ڈیزائن اور سوال نامہ سبھوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ ایک وکیل اپنے موکل سے سوالات اس لیے پوچھتا ہے کہ وہ حقیقت جان سکے، اور اُسے قانون شکنی کے جرم سے بچا سکے۔ ڈاکٹر مریض سے تفتیش کرتا ہے امراض کے متعلق پھر بہت سی اشیاء کی جانچ ہوتی ہے تاکہ صحیح مرض کا پتہ چلے اور مریض کو شفا ہو۔ اس طرح صحافی، دفتروں میں کام کرنے والے افسر سبھوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے انٹرویو کی تکنیک بہت زمانہ سے رائج ہے اور ابھی تک اسے ترک نہیں کیا گیا۔ ادب میں بھی اس کی اہمیت بدستور قائم ہے بلکہ شخصیتوں پر ریسرچ کے لیے تو لازمی ہے اور کوئی فن کار زندہ نہیں ہے تو اُس کے دوستوں، رشتہ داروں اور اس کے ہم عصروں سے انٹرویو لیا جاتا ہے تاکہ صحیح صورت حال کا اندازہ ہو اور اس کا مقالہ حقایق کی کمزوریوں کا شکار نہ ہو۔ لیکن اس انٹرویو کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہی واحد مؤثر ذریعہ ہے۔ جس کے ذریعہ DATA جمع کیا جا سکتا ہے۔

علم معاشیات میں اس انٹرویو کے ذریعہ ایک گھر اور ایک خاندان کی مالی حالت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انٹرویو کے علاوہ اس سلسلہ میں اور کوئی دوسرا قابل اعتماد ذریعہ نہیں۔

اس طرح کسی کارخانہ کی پیداواری طاقت اور مقدار کا اندازہ صرف اُن اعداد و شمار کے ذریعہ نہیں لگایا جا سکتا۔ جو دفتر سے موصول ہوتے ہیں۔ بلکہ اُس کی صحیح تصویر مزدوروں اور کام کرنے والے دوسرے افراد کے انٹرویو کے ذریعہ معلوم ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ اگر اس کارخانہ کے افراد مطمئن، آسودہ خاطر اور معاشی طور پر بہتر ہیں تو اُن میں کام کرنے کی طاقت، ہمّت، لگن اور

ایمان داری بھی ہوگی اور اگر حالت تشفی بخش نہیں ہے تو مایوسی، تراجیت،
بے رُخی اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے پیداواری طاقت میں کمی ہو جائے گی۔
اس طرح اگر بعض غیر معمولی ادبی شخصیتوں کے رشتہ دار، ان عظیم فن کاروں
کی نجی زندگی پر روشنی نہیں ڈالتے تو ہم ایک اہم پہلو سے محروم ہو جاتے ہیں
اور تلاشِ حقیقت کی سعی رائگاں ہو جاتی ہے۔

غالبؔ کی عظمت کا راز صرف اس امر میں نہیں ہے کہ وہ بہت بڑے
شاعر تھے بلکہ اس حقیقت میں بھی ہے کہ غالب نے پُرانے اقدار کے زوال کو
اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ غالب کی اقدار شکنی اور نئی آواز پر لبیک کہنا نہ صرف
جراُتِ رندانہ تھی بلکہ غالبؔ کے تفکر، سماجی بصیرت اور زندگی کی جدوجہد
میں اپنے کو شامل رکھنے کا عزم بھی تھا۔ اب اس کارزارِ حیات میں غالب
کی زندگی کے کئی تاریک گوشے بھی ملتے ہیں۔ ان تاریک گوشوں سے غالب
کی شاعرانہ عظمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن ان کے علم سے تحقیق کے
اہم دروازے وا ہوتے ہیں اور شخصیت کے مطالعہ کے دل چسپ پہلو سامنے
اُبھرتے ہیں۔ اب اگر ان کے معاصرین یا اُن کے شاگردوں نے کہیں اس کی
نشان دہی نہیں کی ہے تو تحقیق کا خزانہ اطلاعات سے خالی رہ گیا۔

اس لیے انٹرویو DATA جمع کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ تصور کیا جاتا
ہے۔ لہٰذا اس سے افراد کے نظریات اور ان کے رویہ پر بھی نگاہ رکھی جاتی
ہے ورنہ دوسرے ذرایع سے ہمیں اخذ کرنے کی زحمت اُٹھانی پڑے گی۔ اور
اس میں مبالغہ کا عنصر شامل ہو جائے گا۔ انٹرویو کے سلسلہ میں LEON
FESTENGER اور DANIEL KATZ نے تو یہاں تک لکھا
ہے کہ اگر انٹرویو کے جوابات فرد کے بس کی بات نہ ہوں تو بھی DATA جمع کرنے کا

مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ افراد اپنے تعصبات اور پیچیدہ رویوں کی وجہ سے بہت سی اطلاع نہ دے سکیں۔ لیکن انٹرویو لینے والا کم از کم اپنے تعلقات، اپنی قربت کے ذریعہ DATA کا تجزیہ آسانی سے کر سکتا ہے۔ اگر ادب میں شخصیتیں ریسرچ کا موضوع ہیں تو انٹرویو واحد موثر ذریعہ ہے جس کی وجہ سے گوشۂ گمنامی میں رہنے والے حقایق روشنی میں آجاتے ہیں۔ اس لیے JAHODA اور COOK نے مشاہدہ اور انٹرویو کو رویوں کے مطالعہ کے لیے بنیادی ذریعہ قرار دیا ہے۔ سماجی علوم اور ادبیات عالم میں ریسرچ کے تقاضے اُس وقت تک پورے نہیں ہوتے جب تک اس طریقۂ کار کا استعمال نہ کیا گیا ہو۔ فن کاروں اور دیگر شخصیتوں کے ماضی کے کارناموں اور مستقبل کے منصوبوں کا علم اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اُن سے براہ راست رابطہ نہ قائم کیا جائے۔ فرد کی قوتِ ادراک، رویّہ اور تصورات و نظریات کو جاننے کے لیے مشاہدہ ناکافی ہے بلکہ بے کار ہے اس کے لیے صرف انٹرویو ہی واحد ذریعہ ہے۔ البتہ قباحت اُس وقت ہوتی ہے جب انٹرویو دینے والا حقایق کی پردہ پوشی کرتا ہے یا اُن کی ترجمانی سے کتراتا ہے۔ ایسی صورت میں اسکالر کی ذہانت اور صبر ہی اُس کے کام آتا ہے۔

انٹرویو کے سلسلہ میں سب سے اہم شئے انٹرویو لینے والے کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ وہ ایک تکنیکی آدمی بن جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے سوالوں کو ترتیب دیتا ہے اور اُن کے دائرہ کو متعین کرتا ہے، اس کا معیار طے کرتا ہے اور پھر معیاری سطح پر ہی اُنھیں تحریر بھی کرتا ہے۔ اس عمل سے اسکالر کے جمع کیے ہوئے DATA کی آسانی سے ترتیب ہو جاتی ہے اور پھر تجزیہ میں اُسے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ ایک انٹرویو لینے والے کا رابطہ چونکہ مختلف افراد سے

ہوتا ہے اس لیے اُسے انسانی نفسیات کا علم ہونا ضروری ہے۔ اُسے انسان کی بنیادی کمزوریوں اور خوبیوں کا پتہ ہونا چاہئے۔

سائنس اور دوسرے سماجی علوم نے انٹرویو لینے کے دوسرے موثر ذرایع پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی ہے اس لیے اس کا موجودہ طریقہ ہی بہتر ہے۔ اُس کے لیے "DONT's" "DO's" کا مشورہ برسوں سے چلا آرہا ہے۔ اسکالر کبھی اس پر عمل کرتا ہے اور کبھی نہیں۔ کیوں کہ ساری کوشش انٹرویو لینے والے کی ذہانت، سمجھ داری اور فنی مہارت سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی لیے ریسرچ کرانے کے سلسلہ میں نگراں کی ضرورت پڑتی ہے۔

انٹرویو میں سوال وجواب کا سلسلہ بھی خاصا دل چسپ ہوتا ہے۔ اس سے اُن خواہشات وجذبات کا پتہ چلتا ہے جو محرکات بن جاتے ہیں اور جواب دینے کے لیے آدمی کو مجبور کرتے ہیں۔ سوال وجواب کی حقیقت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ انسان فطری طور پر اپنے مقاصد، اپنی اَنا اور اپنے مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے اُس کا تمام ذہنی رویہ انھیں کے تابع کام کرتا ہے۔ اُس کا مخصوص رویہ، فیصلہ، کام اور تصور سب کے سب مفادات اور مقاصد کے زیرِ نگیں رہتے ہیں۔ مختلف افراد کے لیے مقاصد کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے۔

ادیبوں اور فن کاروں کے لیے شہرت اور ان کی تسکین سبب بن سکتی ہے۔ یا پھر اسکالر کی شہرت اور موضوع کی دل چسپی بھی جواب دینے والے کو مجبور کرسکتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا من وعن اظہار کرے۔ یا پھر بحیثیت SAMPLE وہ مجبور ہوگئے ہوں کہ سوالوں کا جواب دیں۔ بہت سے لوگ انٹرویو لینے والوں کے مقاصد سے بھی ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن میں احتیاط کا رویہ نظر نہیں آتا۔ حیرت اور استعجاب بھی اس سلسلہ کے

فکری عناصر ہیں۔ پھر سماجی اخلاقی اقدار بھی اُن پر دباؤ ڈالتے ہیں تاکہ حقائق کو اپنی واقفیت کے مطابق بیان کریں۔ مگر یہ صورت تمام جواب دینے والوں کے ساتھ یکساں نہیں رہتی۔ خاص کر ادیبوں، شاعروں کی بے نیازی اس سلسلہ میں بڑی روکاوٹ پیدا ہوتی ہے جب انٹرویو لینے والے کو فرد کی رضامندی مل جاتی ہے تو وہ اپنے سارے سوالوں کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ موضوع سے متعلق باتیں دائرۂ تحریر میں آجائیں۔ اس کے لیے وہ پہلے سے جواب دینے والے کو بہ ذریعہ خط، فون، تار وغیرہ مطلع کر دیتا ہے تاکہ وقت مقررہ پر اُس کا کام شروع ہو جائے۔ سوال کرنے والا اپنی ذہانت تجربہ اور تجزیاتی شعور کے مطابق سوالوں کا انتخاب اس طرح کرتا ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ بات سامنے آجائے اور حقیقت کتنی ہی تاریک اور ناقابل اعتماد کیوں نہ ہو، لکھی جا سکے۔

انٹرویو کا ایک نفسیاتی نکتہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سوالات کے ذریعہ فرد کو متاثر کیا جاتا ہے۔ تاکہ اُس کے نظریات یا ذہنی رویہ میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع ہو۔ مگر ادبیات میں انٹرویو کا یہ مقصد نہیں ہوتا۔ ممکن ہے اس طرح کا طرز عمل نفسیاتی مریض کے لیے بہتر ثابت ہو۔ ایک طبیب اپنے مریض کو اس طرح کے سوالات سے متاثر کر کے اُس کی ذہنی اُلجھنوں کو دُور کر سکتا ہے۔ اعصابی امراض کے مریض کے لیے بھی کارآمد ہو سکتا ہے۔ مگر فنونِ لطیفہ کی کسی صنف کے ریسرچ میں یہ عمل نہ کتھارسس کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور نہ کسی ذہنی اُلجھن کو دور کرتا ہے۔

انٹرویو کی سب سے اچھی صورت یہ ہوتی ہے کہ افراد جن کا انٹرویو لیا جاتا ہے اُن سے پہلے منظوری حاصل کریں، پھر اُن کی سہولت کے

پیش نظر دن، تاریخ مقرر کرلی جائے اور تب قدرے محتاط ہوکر گفتگو کا آغاز ہو۔ یہ گفتگو موضوع کے دائرہ میں ضرور ہونی چاہیے۔ مگر ایسی بھی نہ ہو کہ جواب دینے والا اکتاہٹ محسوس کرے۔ اُس کی دل چسپی موضوع میں اتنی ہی رہنی چاہیے جتنی انٹرویو لینے والے کو ہے۔ اس کے لیے ذہنی رابطہ بھی ایک اہم کڑی ہے۔

اس لیے ماہرینِ فنِ تحقیق اور خصوصیت سے سماجی علوم کے اہلِ علم نے انٹرویو کی قسموں کا ذکر کرتے ہوئے اس کا خیال رکھا ہے کہ انٹرویو بالکل واضح ہوں اور اپنے دائرہ کے اندر ساری اطلاعات حاصل کریں۔

BHANDATKAR اور WIL KINSON نے انٹرویو کی کئی قسموں کا ذکر کیا ہے جن کی طرف ہلکا اشارہ کیا گیا تھا۔ ان کا مختصر جائزہ اسکالر کے لیے ضروری ہے۔

STRUCTURED INTERVIEW اس قسم کے انٹرویو میں پہلے سے سوال نامہ بنا لیا جاتا ہے۔ جس کا معیار اور تکنیک اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس میں ایک سوال ہر طرح کے آدمی کے لیے ایک ہی معنی رکھتا ہے اور اثبات اور نفی میں جواب دریافت کیا جاتا ہے۔

UNSTRUCTURED انٹرویو اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس کے دائرہ میں جو سوالات ہوتے ہیں اُن میں بڑی لچک ہوتی ہے جب کہ پہلے طریقہ میں سوال کا معنی متعین اور واضح ہوتا ہے۔ اس کے معیار کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ سوالات بھی پہلے سے بتائے نہیں جاتے۔ جوابات کے متعلق بھی یقین سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ جواب دینے والا اپنے خیالات اور تجربات کا بے محابا اظہار کرتا ہے۔

لیکن اس کے افراد کے ذہن اور دل و دماغ کو اچھی طرح سمجھا جاتا ہے بشرطیکہ اس طریقۂ کار کا خوبی سے استعمال ہوا ہو۔ غیر ارادی طور پر بہت سے گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ انٹرویو لینے والا بھی آزاد ہوتا ہے وہ جو چاہے پوچھ سکتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے حسب خواہش موضوع کی اہمیت کے مطابق نوٹس تیار کر لیتا ہے۔ وہ جس بیان کو چاہے حذف کر سکتا ہے اور جسے چاہے شامل کرلے۔ مگر ماہرین تحقیق کا خیال ہے کہ اس طریقہ کار میں وقت کی بہت بربادی ہوتی ہے پھر اس کے لیے مختلف علوم وفنون سے واقفیت بڑی شرط ہے اور تفصیل سے جواب سننے کے لیے، سوال کرنے والے کو صبر اور حوصلہ ہونا چاہئے۔

FOCUSSED INTERVIEW اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی خاص تجربی پہلو اور موضوع پر روشنی ڈالی جائے۔ سوال کرنے والا اپنے مقصد میں بالکل صاف ذہن رکھتا ہے اس لیے اس کا سوال نامہ مبہم نہیں ہوتا۔ اس کے موضوعات بھی متعین ہوتے ہیں۔ لیکن طریقۂ کار میں سوالات پوچھنے کی آزادی ہوتی ہے۔ اس طرح کے انٹرویو سے مفروضات کی تعمیر اور تجزیہ میں آسانی ہوتی ہے۔

CLINICAL INTERVIEW یہ فوکس انٹرویو سے قدرے مشابہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ فرد کے احساسات ومحرکات جو اس کی زندگی میں اہم ہوتے ہیں اس کے متعلق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی مقاصد واضح ہوتے ہیں۔ اس کا استعمال علم نفسیات کے ریسرچ میں زیادہ رائج ہے۔

PSYCHOTHERA - یہ طریقہ NONDIRECTIVE

PIST ۔ کے لیے موزوں ہے۔ اس میں براہ راست کوئی سوال نہیں پوچھا جاتا۔ نفسیاتی طریقہ سے جواب دینے والے کو ذہنی طور پر گفتگو کے لیے آمادہ کرلیا جاتا ہے کہ فلاں موضوع پر اپنے خیال کا اظہار کرے۔ اس میں کسی طرح کی پابندی نہیں۔ لیکن یہ بے حد نازک طریقۂ کار ہے اور سوال پوچھنے والے کے لیے علمِ نفسیات کا علم ضروری ہے۔

اِنٹرویو کے فوائد

(۱) ذاتی اِنٹرویو سوال نامہ کی بہ نسبت زیادہ فائدہ کا سبب بنتا ہے۔ سوال نامہ صرف اہلِ علم کے لیے مخصوص ہے جب کہ اِنٹرویو کا دائرہ پوری آبادی کو اپنے اثر میں سمیٹ لیتا ہے۔

(۲) اس کے ذریعہ جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ زیادہ درست اور صحیح ہوتی ہیں۔ جواب دینے والا بہت سی غلط فہمی کو دُور کرسکتا ہے۔ دورانِ گفتگو بہت سی باتوں کی وضاحت ہوتی جاتی ہے اور سوال پوچھنے والا موضوع کو گہرائی سے دیکھ سکتا ہے۔ اُس سے متعلق بہت سی دوسری چیزیں سامنے آجاتی ہیں جن کے متعلق وہ استفسار کرتا ہے۔ اور اصل حقیقت تک اُس کی رسائی ہوجاتی ہے۔

(۳) اِنٹرویو لینے والا فرد کے ماحول اور اس کی ذاتی زندگی کی تہ تک پہنچ سکتا ہے۔ حقیقت کی تلاش کی یہ بہتر اور اعلیٰ ترین تکنیک ہے۔ دورانِ گفتگو وہ بولنے والے کے اندازِ بیان اور چہرے کے

اُتار چڑھاؤ کے ذریعہ بھی اپنے تاثرات کی دُنیا وسیع کرتا جاتا ہے۔
اس وقفہ میں اُسے اس کا بھی احساس ہو جاتا ہے کہ جواب دینے
والے کی بھی حیثیت کیا ہے وہ خصوصی واقعہ، موضوع یا فن کے متعلق
کئی باتیں جانتا ہے۔ لہٰذا سوالات اسی نوعیت سے بدلتے جاتے ہیں
یہ کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں۔

(۴) پہلے سے طے کیے ہوئے انٹرویوز کا سلسلہ کئی دن بھی چل سکتا
ہے۔ کئی گھنٹوں پر بھی یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ اس لیے تفصیل سے
باتیں ہوتی ہیں۔ خصوصیت سے ادب کے میدان اور ریسرچ میں اس
کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ جدید ادب پر ریسرچ کر رہے ہیں تو
باتیں صرف اُردو کے جدید ادب تک نہیں رہ سکتیں۔ عالمی ادب کا ذکر
ضروری ہو جاتا ہے پھر اس کا اعلیٰ ادب سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ موجودہ
صدی کی تکنیکی ترقی میں جدید ادب کے نئے تقاضوں کی بات ہوتی ہے۔
عمومی فلسفیانہ مزاج بحث میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس طرح دو آدمیوں
کے درمیان کی یہ گفتگو اگر معیاری ہے اور دونوں اعلیٰ علم کی سطح پر ہیں تو
یہ گفتگو ٹیپ کرنے کے لائق ہوتی ہے اور ادبی و تہذیبی تذکروں میں
اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ یہاں دونوں کی صلاحیتوں سے
واقفیت کا موقع ملتا ہے۔ ادب میں کیے جانے والے ریسرچ میں انٹرویو
کی یہ قسم بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ ان دنوں اس کی مقبولیت خصوصیت
سے پاکستانی ادب کے سلسلہ میں بڑھ گئی ہے۔ پاکستان سے فیض، احمد فراز
فہمیدہ سے لیے جانے والے انٹرویو کا جائزہ لیجیے تو بہت سی کام کی
باتیں ملیں گی۔ انھیں پڑھ کر نہ صرف حیرت ہوتی ہے۔ بلکہ پاکستانی

ادب میں احتجاج کی ایک نئی آواز بھی سُنائی دیتی ہے۔ جس کی طرف ہندوستان کے جدید ادب کے پرستاروں نے دھیان نہیں دیا۔

(۵) اس طریقۂ کار میں انٹرویو کی زبان خاصی اہم ہوتی ہے۔ سوال پوچھنے اور جواب دینے والے کی زبان اور اس کی لیاقت بھی مد نظر رہتی ہے اور اس کا برابر خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے تشریح و تفسیر میں دشواری ہو۔

(۶) پیچیدہ اور گمبھیر واقعات کی حقیقت کو جاننے کے لیے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ ادبیات اور سماجی علوم کے دائرہ سے نکل کر اگر ہم قانون شکنی کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور سزا و جزا کی طرف نگاہ رکھیں تو اس حقیقت کا پتہ چلے گا کہ پولس کے محکمہ کا سارا نظام اسی تفتیش پر مبنی ہے۔ یہاں یہ بحث نہیں کہ اس میں صداقت کہاں تک اُس کے ہاتھ لگتی ہے۔ کورٹ میں بھی جرح کی نوعیت دراصل اس سے متاثر ہے۔ البتہ ان کی شکل بدل جاتی ہے اور جواب دینے والا کسی قدر قانون سے سہما ہوا رہتا ہے۔ اخلاقی اقدار کے دباؤ سے وہ ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

مُلازمتوں کی بحالی کے سلسلہ میں جو سوالات کیے جاتے ہیں عام طور پر اُن کا تعلق ریسرچ سے نہیں ہوتا۔ لیکن وہ بھی انٹرویو کی ایک ایسی قسم ہے جس سے نہ صرف اُمیدواروں کی لیاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ نظام تعلیم کی خرابیاں اور خوبیاں بھی اُجاگر ہوتی ہیں۔ مگر انٹرویو کی ان تمام خصوصیات کے باوجود اس میں چند نقائص بھی ہیں یہ کمزوریاں فطری ہیں ان پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی بھی علم

اپنی جگہ مکمل نہیں ہے اگر مکمل ہو جائے تو علم کا ارتقا ہی رک جائے اس طرح انٹرویو کی اپنی محدودیت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے، اور اسکالر کو ہر وقت کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ان پر قابو پائے۔ اُس کی یہ سعی جتنی دیانت داری کے ساتھ جاری رہے گی اُس کا کام اتنا ہی معیاری ہوگا۔ تلاشِ حق میں اُس کے قدم مضبوطی سے جمے رہیں گے۔

۱ــــ اس طریقۂ کار کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں وقت، انرجی اور روپیہ کا صرفہ کافی ہوتا ہے۔ انٹرویو دینے والا کسی دوسرے شہر میں رہتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اسکالر کے گھر کے آس پاس کا رہنے والا ہو۔ اُسے سفر کی صعوبتیں اور اخراجات برداشت کرنے ہوں گے۔ یونی ورسٹی میں کام کرنے والے اساتذہ کرام اور اسکالرس کے لیے ان کو برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔

۲ــــ اگر نگراں اور اسکالرس کی ذہنی اور علمی سطح اعلیٰ نہیں ہے اور وہ موضوع سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقفیت نہیں رکھتے تو وہ اس طرز انٹرویو کو سلیقہ سے نباہنے میں معذور رہیں گے۔

۳ــــ سوال وجواب کے دوران محقق اُن تعصبات سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ پوچھنے والے اور جس شخص کا انٹرویو مقصود ہے دونوں کے اپنے تحفظات ہوتے ہیں۔ اپنے تعصبات کے دائروں سے وہ واقف نہیں ہوتے انھیں اس کی اطلاع بھی نہیں ہوتی کہ اُن کا کون سا طرزِ عمل اُن کی عصبیت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

۴ــــ ریسرچ چونکہ واقعیت کی تلاش کا بھی نام ہے اس لیے اسکالر کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے بیانات کے علاوہ جمع کیے گئے DATA کی

چھان بین بھی اس طرح کرے کہ مبالغہ آمیزی کم سے کم رہ جائے اور موضوع سے متعلق حقایق بہتر اور معروضی طور پر سامنے لائے جائیں۔

5۔ انٹرویو ہر اسکالر لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لیے نگراں کو چاہیے کہ وہ اس کے طریقوں سے واقف کرائے۔ گویا ایک طرح کی ٹریننگ اُسے دی جائے تاکہ اُسے استفسار کی جن منزلوں سے گزرنا ہے اُس میں کوئی مضحکہ خیز پہلو رونما نہ ہو۔

۶۔ ذاتی تعصبات پسند اور ناپسندیدگی کی وجہ سے اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ سوال اس طرح پوچھا جائے کہ موضوع کے تقاضے پس پشت نہ پڑ جائیں۔

۷۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جواب دینے والا حقیقت کے بجائے اپنے تخئیل کی پرواز میں مصروف ہو جاتا ہے اور انٹرویو لینے والا پریشانی میں پڑ جاتا ہے اور اس کے تمام سوالوں کی معنویت رکھی رہ جاتی ہے۔

ان کمزوریوں کے باوجود انٹرویو کا طریقہ نہ صرف ضروری ہے بلکہ سماجی علوم اور ادبیات کے ریسرچ کی دُنیا میں اس کی اہمیت بدستور قائم ہے۔ اس کے فوائد ان کمزوریوں سے کہیں زیادہ ہیں جن کا ذکر کیا گیا۔ البتہ ضرورت اس امر کی ہے کہ نگراں اسکالر کی علمی سطح کے مطابق اُسے تربیت دے یا تربیتی کلاس میں اُسے بتایا جائے کہ انٹرویو کے طریقے کیا ہیں؟ اُس کی قسمیں کتنی ہیں اور کس طرح ان کی دشواریوں پر قابو پایا جائے۔ اگر اسکالر کی تربیت نہیں ہوتی ہے اُسے علم نہیں کہ سوالات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے، رابطہ

کس طرح قائم کرنا چاہیے تو اسکالر بجز اپنی لاعلمی و بے خبری کے کچھ ظاہر نہیں کر سکتا۔ وہ ضروری DATA جمع کرنے کے بجائے غیر ضروری معلومات حاصل کرے گا۔ اسی لیے سوال نامہ کی ترتیب اور اُس کے ڈیزائن کی اعلیٰ سطح ہونی چاہئے اور موضوع کو پیشِ نظر رکھ کر ساری باتوں کو سمیٹنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ دراصل یہ آرٹ ہے۔ اگر آپ مشہور صحافیوں اور سیاسی لیڈروں کے انٹرویو کا مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی لیڈر اِن وقت اپنی گفتگو کے دوران اُن حقایق کا انکشاف کر دیتے ہیں، جس کا ظاہر کرنا اُن کا مقصد نہیں تھا۔ اور جن سے اُن کی حکومت کی خفیہ پالیسی وضع ہوتی ہے۔ بجٹ کے سلسلہ میں خاص طور سے ہر سال صحافی وزیر معاشیات سے رجوع ہوتے ہیں۔ اب اگر صحافی ذہین ہے، تجربہ کار ہے انسانی نفسیات کے علم سے واقف ہے، انٹرویو کے آداب سے آشنا ہے اور اُن تمام تکنیک کو سمجھتا ہے جو انٹرویو کے لیے ضروری ہیں تو وہ اپنے مطلب کی باتیں چند لمحوں میں نکال لیتا ہے۔

اس طرح ادبیات کی ریسرچ بھی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ فن کار جو زندہ ہیں اور جن کا ادبی سرمایہ قابل لحاظ ہے۔ اپنی نجی زندگی کے اہم واقعات کو منظر عام پر لانا نہیں چاہتے، اس موضوع پر شاید بہت سے فن کار دامن بچاتے ہیں۔ اب انٹرویو لینے والا اگر ہنر مند ہے، اسرار و رموز سے با خبر ہے تو وہ ان مشکلوں پر قابو پا لیتا ہے۔ وہ افراد سے ایک ایسا تعلق پیدا کر لیتا ہے جس سے قربت کی فضا بنتی ہے۔ اعتبار اور دوستی کی سازگار فضا کے ذریعہ وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے، جب سوال کرنے والے کو تمام تکنیک معلوم ہو، اور وہ جواب

دینے والے کو یہ احساس نہ ہونے دے کہ اُس کا امتحان لیا جا رہا ہے بلکہ یہ احساس پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرے کہ وہ تبادلہ خیال کے ذریعہ ایک اہم فرض کو پورا کر رہا ہے۔ اس لیے بات چیت بالکل غیر رسمی ہونی چاہئے غیر رسمی گفتگو میں آدمی بہت کھل کر باتیں کرتا ہے اور اپنی زندگی کے تاریک پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے۔ بنیادی طور پر انٹرویو کا کام ایک رپورٹر جیسا ہوتا ہے۔ اس لیے اُسے گفتگو کو بحث و مباحثہ کا رنگ نہیں دینا چاہئے اور کسی معاملہ میں اپنے مخاطب سے اُلجھنے کی بھی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ ہر لمحہ ایک خوشگوار فضا کو بنائے رکھنے کی کوشش جاری رکھنی چاہئے۔ البتہ اُسے اپنے سوالوں کا انتخاب نہایت ہوشیاری سے کرنا چاہئے تاکہ جواب دینے والا حقیقت بیانی سے کام لے سکے اور اسکالر کے موضوع پر اُس سے روشنی پڑتی ہو۔ لہٰذا سوالات کی ترتیب میں تسلسل اور ہم آہنگی کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جواب دینے والے کے ذہنی رویّہ اور معلومات کا بھی اندازہ ہوگا۔

اسکالر کو کبھی کبھی دشواری اُس وقت ہوتی ہے جب وہ بعض سوالوں کا جواب مبہم پاتا ہے ایسی صورت میں اُسے نہایت دانش مندی سے بہ طریق احسن اپنے سوال کو پھر وضاحت کرنی چاہئے تاکہ جواب دینے والا دلچسپی برقرار رکھ سکے اور اسکالر کی دشواریوں کے پیش نظر اُن واقعات، خیالات کی طرف اشارہ کرے جو مطلوب ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جواب دینے والا اکثر سوالوں کو منفی صورت میں دیکھتا ہے اور 'نہیں' میں جواب دیتا ہے۔ یہ بڑا نازک اور مشکل مسئلہ ہے اسکالر کو یہ سوچنا چاہئے کہ کیا واقعی وہ سوال کا جواب نہیں جانتا یا قصداً

لاعلمی کا اظہار کر رہا ہے - اگر وہ واقعات یا حقیقت کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے تو اس انکار کی وجہ اور اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور یہ بھی تجزیہ کا محتاج ہو جاتا ہے۔

انٹرویو کو ریکارڈ کرنے کا مسئلہ بھی اس طریقۂ کار کا ایک حصہ ہے۔ اس کے بھی دو حصے ہیں:

الف: اگر سوال متعین ہے تو ہاں اور نہیں میں جواب لکھنا نہیں ہے، بلکہ نشان لگا دینا ہے۔

ب: لیکن اگر سوال نامہ اس کے برعکس ہے تو جواب دینے والے کی گفتگو بجنسہ لکھنی ہوگی۔

اس سلسلہ میں اُن غلطیوں سے اسکالر کو بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو تحریر کے وقت اُس سے سرزد ہوئی ہیں۔ چونکہ ایک ہی وقت میں اُسے سوال کرنا اور جواب لکھنا بھی ہے۔ پھر اُس کی وضاحت کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ اُن کا جواب بھی سننا ہے اور اُس میں اپنے کام کی باتوں کو نوٹ کرنے کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ اس لیے یہ احتمال برابر رہتا ہے کہ غلط باتیں بھی لکھ لی جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بے حد ضروری اطلاعات اور معلومات چھوٹ جائیں۔ یہ ساری باتیں شعوری نہیں ہوتیں بلکہ ذہن چوکنا اور مسلسل بیدار نہ رہنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ اہم نکات کی طرف فرد کی توجہ پھر سے مبذول کرانے کی کوشش کرے۔ اس کام کے لیے ہو سکتا ہے اُسے کئی بار مخصوص فرد کے پاس جانا پڑے۔ لیکن، یہ تحقیق کی ایسی دشواریاں ہیں جن پر قابو پائے بغیر ریسرچ اسکالر تحقیق کی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

غیر متعین سوالوں کے جوابات کے لیے یہ ضروری ہے کہ جواب کو ہو بہو لکھا جائے اگر اسکالر کوڈنگ سے واقف ہے تو اُسے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ جوابات کو ترتیب اور سلیقہ سے لکھنے کی منزل بھی اہم ہوتی ہے۔ کیوں کہ سارے جوابات ایک جیسے نہیں ہوتے۔ انٹرویو کے سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تین طرح کا عمل ایک ساتھ جاری رہتا ہے۔

۱۔ سوالات کی بوچھار

۲۔ جواب

۳۔ جوابات کو ریکارڈ کرنے کا عمل

اس لیے ان اعمال میں ہم آہنگی قائم کرنا آسان نہیں۔ وہ شارٹ ہینڈ کا طریقہ بھی استعمال کر سکتا ہے۔ یا دوران تحقیق وہ شناخت کی خاطر بہت سی علامتیں بنا لیتا ہے اور انھیں علامتوں کے ذریعہ وہ تفصیلات جمع کر لیتا ہے لیکن ان علامتوں کی نہ ادب میں اہمیت ہوتی ہے اور نہ دوسروں کے کام آتی ہیں۔ ان کا تعلق ایک مخصوص اسکالر سے ہوتا ہے جس نے اپنی آسانی کی خاطر چند نقوش بنا لیے ہیں اور انھیں علامتوں کی شکل دے دی ہے۔

انٹرویو لینے والے کو اپنے تعصبات اور تحفظات سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔ وہ بھی آدمی ہی ہوتا ہے اور اپنی پسند اور ناپسندیدگی کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ اس لیے تعصبات کی عدم موجودگی کا امکان بہت کم رہتا ہے۔ لہذا کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ قابو پایا جائے، اور معروضی طریقۂ کار کو اختیار کیا جائے۔ اس رویہ کے لیے دو عناصر ذمّہ دار ہوتے ہیں۔ سوال پوچھنے والا، جواب دینے والے کے تئیں مخصوص رویہ اختیار کرتا ہے اور سوال سے۔ جواب دینے والے شخص کی گفتگو کے دوران ایک خاص

رویہ اُبھرتا ہے۔ لہٰذا دونوں کے لیے کھلے ذہن سے گفتگو کرنی ضروری ہے۔ کبھی کبھی سوال کرنے والے کو جوابات سے تشفی نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ پہلے سے فرد مخصوص کے متعلق بڑی اونچی باتیں سوچ کر چلا تھا۔ جواب سُن کر اُسے یک گونہ مایوسی ہوتی ہے۔ اس کا کوئی حل نہیں بجز اس کے سوال نامہ کو از سر نو ترتیب دیا جائے تاکہ اسکالر کی اعلیٰ اُمیدیں پوری ہوسکیں۔ تعصبات کے سلسلہ میں ایک دشواری اسکالر کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ وہ پہلے سے شخصیتوں اور افراد کے متعلق مفروضات بنا لیتا ہے۔ اگر یہ مفروضات جوابات کی روشنی میں پورے نہیں اُترتے تو کبھی کبھی اسکالر زبردستی دخل در معقولات کی کوشش کرتا ہے اس امر سے اس کی اَنا کو تسکین تو ہوجاتی ہے لیکن یہ خود فریبی ہے۔ تحقیق نہیں۔ تحقیق حقیقت کی تلاش کا نام ہے اور حقیقت ہماری خواہشوں کے مطابق دکھائی نہیں دیتی۔ اس لیے اسکالر کو غیر ذمہ دارانہ باتوں سے گریز کرنا چاہیے اور وہی باتیں ریکارڈ کرنی چاہیے جو اُس نے زبانی سُنی ہیں۔ اور انھیں کی بنیاد پر نتائج نکالنے کی منزلوں سے گزرنا چاہیے۔ یہ ایک دیانت دار اسکالر کے لیے ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں نگراں یا کسی پروجیکٹ کے "ڈائریکٹر" کو تحقیق کے ابتدائی اصول اور طریقۂ کار کی تربیت دینی چاہیے۔ تربیت یافتہ اسکالر کم سے کم وقت میں بغیر کثیر رقم کے تحقیق کی دُنیا میں قدم رکھ سکتا ہے اور اعلیٰ نتائج اخذ کرنے میں اُسے کامیابی ہوسکتی ہے۔ نیز وہ انٹرویو کے مسائل سے بخوبی نبرد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا کرلیتا ہے کیوں کہ DATA حاصل کرنے کا یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے بغیر اطلاعات اور معلومات کی حقیقی دُنیا تک ہماری رسائی ممکن نہیں۔

نمونوں کی قسمیں اور سَروے

ادبیات کے طالب علم اور اسکالر نمونہ کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تعلق سائنس اور سماجی سائنس سے ہے۔ ادبی تحقیق کی کسی منزل میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ غلط خیال ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں ہم سینکڑوں ایسے کام کرتے ہیں جس سے نمونوں کا کام لیا جاتا ہے اور جنھیں مثال بناکر ہم نئے تجربات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ عورتیں چاول پکاتے وقت سینکڑوں چاول کے دانوں کو چھوکر یہ پتہ نہیں لگاتیں کہ چاول تیار ہوا ہے یا نہیں۔ چند دانوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ چاول بن گیا اور اُسے چولھے سے اُتار لینا ضروری ہے۔ یہ چند دانوں کا عمل نمونہ یا (SAMPLING) ہے۔ اگر ہم 'ریختی' کیا ہے جاننا چاہیں تو چند اشعار کی مدد سے ریختی کے سارے سرمایہ کا اندازہ کر سکتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ لکھنؤ اسکول کے تمام صاحب دیوان شعرائے کرام کے یہاں ایسے اشعار کی چھان بین شروع کر دیں جن پر ریختی کے اثرات ہیں۔ ہمارا یہ ادبی عمل ایک طرح کا نمونہ کا عمل ہوگا۔ جس طرح چاول کے چند دانوں کو چھوکر ایک کھانا پکانے والی خاتون یہ پتہ چلا لیتی ہے کہ چاول تیار ہو گیا اُسی طرح مسلم معاشرہ اور مُسلم آبادی کے ایک خاص طبقہ کے افراد کا انتخاب کر کے یہ بھی پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک فیملی پلاننگ کو بہتر تصور کرتے ہیں اور کیوں وہ اس پر عمل پیرا ہیں۔ ساٹھ سال کے ترقی پسند ادبی سرمایہ کے تفصیلی جائزہ کے بغیر بھی چند نمائندہ فن کاروں کی تخلیقات کو بطور نمونہ سامنے رکھ کر اُس عہد کی ادبی خصوصیات کو پیش کر سکتے ہیں۔

غرض ادب میں نمونوں سے اُسی طرح کام لیا جا سکتا ہے جس طرح

سائنس اور سماجی سائنس کی تحقیق میں نمونوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔
غزل کے چند اشعار، غزل کی جن خصوصیات کو بیان کرتے ہیں وہ ایک طرح سے پوری غزل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ البتہ ان اشعار کا انتخاب بعض بہتر تنقیدی صلاحیت کے افراد کے ذریعہ عمل میں آیا ہو۔

(بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں A. L. BOWBY نے سماجی سائنس میں نمونوں کے ذریعہ مفید حقائق کو ہمارے سامنے لایا۔ اس لیے نمونوں کے سلسلہ میں اُس کے کاموں کو سنگ میل تصور کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی تحقیق کے جن نتائج تک پہنچا اُس میں sampling کا طریقہ بہت مفید ثابت ہوا۔ اُس نے یہ بھی ثابت کیا کہ اس کے ذریعہ تحقیقی عمل کی مدت بھی بہت کم ہو جاتی ہے، اوقات کی کمی، اخراجات کی کمی کا باعث بنتی ہے اور صحت مند نتائج اُبھرتے ہیں۔ اس لیے سماجی سائنس میں نمونوں کی تکنیک نے اہمیت اختیار کرلی اور اس پر خاصا زور دیا جانے لگا۔

نمونہ آبادی سے حاصل کیا ہوا ایک جزو ہے۔ آبادی سے مُراد صرف انسانوں کی آبادی نہیں ہے بلکہ انسانوں، اشیاء، ادبیات، مشاہدات کے دستاویز اور ایسی تمام چیزیں اس میں شامل ہیں جو زیر مطالعہ ہیں۔ ان کے مجموعی حصہ کو تکنیکی اصطلاح میں ہم آبادی کا نام دیتے ہیں۔ اگر ہم لڑکے لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے متعلق کسی ادارہ کے طالب علموں کی رائے جاننا چاہیں تو ہماری تحقیق کا جو UNIVERSE ہوگا اُس میں کالج کے تمام طلبا اور طالبات شامل ہوں گی۔ اب اس 'آبادی' کی تقسیم ہو سکتی ہے۔ اسے کئی حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ (نمونوں کے ذریعہ ہم نمائندہ افراد، اشیا، ادبی شہ پاروں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کے متعلق اپنے مفروضات کو ثابت کرتے ہیں اور ان کی خصوصیات کو اُجاگر

کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کسی شہر کی چار لاکھ کی آبادی کی رائے جاننی ضروری ہے تو یہ ایک محقق اور اسکالر کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے وہ نمونوں کا انتخاب کرے گا۔ اب اس انتخابی عمل میں وہ سب باتیں شامل ہونی چاہیے جن کی مدد سے وہ چار لاکھ انسانوں کی رائے کو تقریباً پوری آبادی کی رائے کہہ سکتا ہے۔ لیکن یہ رائے درست اُس وقت ہو سکتی ہے جب اس کی تربیت اور پلان ٹھیک سے بنایا گیا ہو۔ اس نمائندہ نمونے کے ذریعہ اسکالر بہت حد تک صحیح رائے قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ نمائندہ نمونوں کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ "کُل" کی خصوصیات کا ترجمان ہے۔ اس سے تحقیق کی دشوار منزل آسان ہو جاتی ہے۔ اس کی مزید وضاحت افسانوی ادب کی تحقیق و تنقید سے یوں دی جا سکتی ہے۔ مان لیجیے کہ سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کے رویوں سے ہمیں بحث کرنی ہے یا تحقیق کرنی ہے۔ اگر منٹو نے ایک ہزار افسانے لکھے ہیں اور ہر افسانے میں تین نسوانی کردار ہیں تو تین ہزار نسوانی کرداروں کے رویوں کا مطالعہ خاصا دشوار ہو جائے گا۔ اس لیے ہم نمائندہ افسانوں کی روشنی میں ایسے کرداروں کا انتخاب کریں گے جن کے رویوں کے مطالعہ کے بعد ہم سعادت حسن منٹو کے نسوانی کرداروں کے رویوں اور سلوک کے متعلق قطعیت کے ساتھ کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔ اس عمل کے لیے جو تکنیک استعمال کی جائے گی اُسے ہم Sampling کہیں گے۔

اب ان نمونوں کا جائزہ لیجیے جنھیں ماہرین فن نے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ لیکن اقسام کے ذکر سے پہلے ایک لفظ PROBABLITY کی تشریح ضروری ہو جاتی ہے۔ ــــــ اس کا تعلق نمونوں سے براہ راست ہے۔ کسی سوال کے جواب میں اکثر و بیشتر ہم 'شاید'، "تقریباً" جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لفظ کا تصور نمونوں کے انتخاب کو سمجھنے میں مدد دے گا۔

اوسطاً نمونہ ' کل ' کی خصوصیات کا نمائندہ ہوگا اور دونوں میں آسمان زمین کا فرق نہیں ہوگا۔ گویا امکانات کا تعلق حقایق سے مضبوط ہوجاتا ہے۔ سماجی علوم میں جب بھی نمونوں کا ذکر ہوتا ہے یا کوئی اسکالر اس کی روشنی میں جائزہ لیتا ہے تو وہ اس لفظ کے استعمال سے خود کو بچا نہیں سکتا۔ یہ نمونوں کا ایک جز ولاینفک ہے اور اسے ہم نمونوں کی ایک قسم بھی تصور کرسکتے ہیں۔

نمونوں کی تشریح کے بعد اُس کی قسموں کا جائزہ بھی ضروری ہے۔ سب سے اہم قسم SIMPLE RANDOM SAMPLE کی ہے، اور سچ کہیے تو اس کے دائرہ میں دوسرے نمونے آجاتے ہیں۔ یہ وہ طریقہ کار ہے جو آبادی یا "یونیورس" کے ایک جزو کی اس طرح نمائندگی عطا کرتا ہے، جس میں اس کا پورا امکان پوشیدہ رہتا ہے کہ آبادی کی ہر اکائی شامل ہوجائے۔

RANDOM لفظ سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ بغیر کسی واضح مقصد اور منزل کے کوئی شئے اچانک آگئی۔ سائنس داں جو اس تکنیک کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں لغت میں دیے گئے معنوں تک اپنی دنیا محدود نہیں سمجھتے۔ کوئی چیز خود بخود نہیں ہوتی، بلکہ ہونے یا نہ ہونے کی وجہیں ہوتی ہیں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی معلومات بہت کم ہیں۔ اس لیے وہ ATRANDOM ہونے والی شئے کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

نمونوں کی دوسری قسموں میں مقصدی نمونے یعنی PURPOSIVE SAMPLING کا ذکر خصوصی طور پر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نمونوں کی دیگر قسموں میں STRATIFIED SAMPLES

اور CLUSTER SAMPLES بھی شامل ہے۔

پہلی قسم میں آبادی کو عورتوں، مردوں، گورے، کالے کی خصوصیات کی بنا پر نمونوں کی شکل دیتے ہیں۔ دوسری قسم کا کثرت سے استعمال سروے کے لیے کیا جاتا ہے۔

(سروے میں ڈاٹا کا ذخیرہ کثیر آبادی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ گویا کثیر آبادی سے SAMPLE چُن لیے ہیں۔ اس کے بھی حاصل کرنے کے طریقے ذاتی انٹرویو، ——— جیسی دوسری ایجنسیاں ہوتی ہیں۔ اس طرح کے مطالعہ کو سروے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خاص کر جب مختلف النوع انسانوں سے موضوع کا واسطہ ہو اور اطلاعات کی قسمیں کثیر اور قدرے پیچیدہ ہوں۔ کثیر آبادی سے SAMPLE انتخاب کرتے وقت اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ ہر طرح پوری آبادی کا نمائندہ بن جائے۔

اس بنیادی سروے کا جائزہ جیسا کہ سماجی علوم میں کیا جاتا ہے ملی جلی تکنیک سے تیار ہوتا ہے۔ اس کے تدریجی ارتقاء میں مختلف سماجی علوم نے بڑا ہاتھ بٹایا ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال انٹرویو ہے۔ انٹرویو کا یہ طریقہ خاص طور سے 'علم بشریات اور علم نفسیات' کے تجربوں سے حاصل ہوا ہے یا اُس ڈسپلن سے حاصل ہو سکتا ہے جس نے ذاتی انٹرویو کے فارم کو ایک طریقۂ تحقیق کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔

سروے کا طریقہ کسی خاص ڈسپلن کا حصہ نہیں ہے۔ اس کا استعمال بہت سے موضوعات کے لیے ہوتا ہے۔ خاص کر BEHAVIOURAL SCIENCE کے مطالعہ میں بہت مدد ملتی ہے۔ جب انسانی رویوں اور برتاؤ کا

مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے تو ادب کی دنیا وسیع ہو جاتی ہے اور محقق
کی ذمہ داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں۔ وہ ہر ڈسپلن کی مدد سے مخصوص برتاؤ
اور رویوں کا تجزیہ کرنے لگتا ہے اور پھر بے حد مناسب نتائج سامنے
ابھر جاتے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ سروے کا اُن آدمیوں سے یا اُن کے
SAMPLE سے براہ راست تعلق ہوتا ہے جن کی خصوصیات اُن کے
فکری رویہ اور اسلوب سے جھلکتی ہیں۔ اس طرح سروے کا طریقہ لائبریری
اور آرکائیو سے مختلف ہوتا ہے۔ سروے تکنیک وہاں استعمال کی جاتی ہے،
جہاں خصوصی معلومات بہ آسانی دستیاب ہو سکیں اور نسبتاً اس میں اخراجات
بھی کم ہوں۔ مگر قباحت یہ ہوتی ہے کہ جب تک عوام اطلاعات کی فراہمی کے
لیے تیار نہ ہوں، اُس وقت تک اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ عام
نفسیات یہ ہوتی ہے کہ عوام کی کثیر تعداد کوئی اطلاع دینے میں بے حد جھجھکتی
ہے یا تو کوئی خوف در پردہ کام کرتا ہے یا اطلاع لینے والا عوامی نفسیات
سے عدم واقفیت کی بنا پر ان سے اطلاعات حاصل کرنے میں ناکامیاب
رہتا ہے۔ اگر عوام تیار نہ ہوں تو اُن پر کسی قسم کا دباؤ بھی نہیں ڈالا
جا سکتا۔ اس لیے نہایت خوش اسلوبی سے تیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے
ایک بار وہ آمادہ ہو گئے تو اطلاعات کا خزانہ مل جاتا ہے اور اسکالر کی
بہت بڑی پریشانی دور ہو جاتی ہے۔

سروے اسکوپ ڈیزائن اور مواد کے اعتبار سے ایک دوسرے
سے مختلف ہوتا ہے۔ ان کا استعمال کسی مخصوص مقصد کی بر آوری کے لیے ہوتا
ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں بھی سروے ڈاٹا جمع ہوگا وہاں کسی خاص ڈیزائن کو
سامنے رکھنا ہوگا۔ ان کے ذریعہ ڈاٹا جمع ہوگا۔ اس کام کے لیے بہت سے کام

کئی بار کرنے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی بہت سا سروے ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی آدمی سے دوبارہ انٹرویو لینا پڑتا ہے۔ ایسا اُس وقت ضروری ہوتا ہے جب کسی فرد کے افعال و نظریات میں کوئی خاص تبدیلی واقع ہو۔ اور کچھ عرصہ بعد وہ اپنی سابقہ حیثیت اور مسلک سے دست بردار ہو جائے۔

WITHEY اور LANSING نے ایک قومی سروے کے ذریعہ یہ جاننا چاہا تھا کہ بارہ مہینوں کے اندر عوام گاڑی خریدنا پسند کریں گے یا زندگی کی دوسری کارآمد اشیا اُن کے لیے مفید ہوں گی۔ اس بات کو جاننے کے لیے انھوں نے ایک بڑا سروے کیا۔ جس میں عوام کے خیال میں نمایاں تبدیلی ہوئی اور ان تبدیلیوں کی خبر سے انڈسٹری اور معاشیات کے شعبہ پر کافی گہرے اثرات مرتسم ہوئے۔ کیوں کہ بارہ مہینوں کے اندر لوگوں کی نفسیات بدل گئی تھی۔ سروے کا موضوع یا اُس کے ذریعہ حاصل کیا جانے والا DATA اہم تو ضرور ہوتا ہے پر اس کے حصول کے طریقے بہت مشکل اور دقت طلب ہیں اس طرح سروے کو بھی ماہرین تحقیق نے کئی ذیلی حصوں میں تقسیم کیا ہے:-

ذاتی DATA : اس ذیل میں اکثر و بیشتر جنس، پیشہ، تعلیم، مذہب، قومیت، مختلف جماعت کی ممبرشپ اور دوسرے ذاتی سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی آمدنی، جائداد، قرض اور دوسرے VARIABLES بھی شامل ہوتے ہیں۔ اُن کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے افراد کے ذریعہ جو ڈاٹا حاصل کیا گیا ہے اُن کو سامنے رکھ کر تجزیہ کی منزلوں سے گذرا جائے۔

ENVIRONMENTAL DATA : بہت سے

سروے میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ جواب دینے والے کی زندگی کن حالات میں بسر ہو رہی ہے۔ یعنی اُس کا تہذیبی تناظر کیا ہے۔ وہ کن حالات میں زندگی گزار رہا ہے۔ پھر اُس کے مطابق اُس کے پڑوسیوں کے طرز زندگی کا مطالعہ بھی لیا جائے تاکہ اُن خارجی حالات اور ماحول کا بھی اندازہ ہو سکے۔ جو جواب دینے والے کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ــــــــــــــــ
ــــــــــــ۔ کیوں کہ یہ وہ عناصر ہیں جو اُس کی تہذیبی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ مخصوص رویوں کے اظہار پر مجبور ہو جاتا ہے۔

BEHAVIORAL DATA : بہت سے مسائل افراد کی شعوری اور لاشعوری زندگی سے اس طرح وابستہ ہوتے ہیں کہ جب تک اُن گرہوں کی عقدہ کشائی نہ ہو، موضوع کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ ایک ہی فرد کا رویہ مختلف اوقات میں ایک جیسا نہیں رہتا۔ یا مختلف افراد کے ساتھ بدل جاتا ہے اور اُس میں ایک طرح کی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی میں خوش و خرم رہ سکتی ہے۔ شوہر اُس کی وفاداری پر کبھی شک و شبہ نہیں کرتا۔ لیکن وہی عورت اپنے محبوب (خواہ وہ سابق ہو یا حالیہ زندگی کا عاشق) کے ساتھ ایک بدلی ہوئی شکل میں نظر آتی ہے۔

موپاساں کی کہانیوں کو پڑھیے تو عورت کی وفاداری اور

اُس کے عشق کی نئی شکلیں کثرت سے ملیں گی۔ میں اس ایک رویہ کو بے حیائی بے شرمی اور قابلِ رسوائی نہیں تصور کرتا۔ کیوں کہ اس کا تعلق انسان کی اُس پیچیدہ جبلّت سے ہے جس پر قابو پانا مقدس شخصیتوں کے بس کی بات بھی نہیں۔ ایک عورت اپنے شریک حیات کے ساتھ پوری ذمہ داری کے ساتھ رہتی ہے۔ لیکن اپنے چاہنے والے کی رفاقت میں اُس کی شخصیت کی پیچیدہ نہیں کھلتی جاتی ہیں۔ یہاں وہ تمام سماجی پابندیوں سے آزاد اپنی روحانی اور جنسی زندگی کو ارتفاع بخشتی ہے۔ اس لیے ایک نظر میں اُس کے رویوں کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں سعادت حسن منٹو کی کہانیوں کو پڑھیے تو آپ کو منٹو کے فن کی عظمت کا راز معلوم ہوگا۔ ایک عورت باوجود بازاری داشتہ طوائف' اور بکاؤ ہونے کے اپنی تمام تر نسائیت میں زندہ رہتی ہے۔ ایک معصوم فساد زدہ لڑکی عصمت دری کی منزلوں سے گزرتی ہوئی اپنا ہوش و حواس کھو دیتی ہے۔ اُس کے کان صرف آواز کو سُننے کے عادی ہیں۔

'کھول دو' اُس کے ذہنی رویہ کی پرکھ کے لیے صرف ظاہر کی حقیقت کو جاننا ضروری نہیں بلکہ لاشعور اور شعور میں چھپے ہوئے سینکڑوں سوالات کو کریدنا ضروری ہے۔

عصمت کے افسانوں کا مطالعہ بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو دلچسپ حقائق سامنے آئیں گے۔

افسانوی ادب سے ہٹ کر شاعری کا جائزہ بھی مفید ہوگا۔ گزشتہ پچاس سال کے شعری ادب کا ایک تجزیاتی مطالعہ اُس وقت تک غیر جانبدارانہ اور سائنسی نہیں ہوگا جب تک ان شاعروں کے رویوں سے بحث نہ کی جائے

اور ان کا جائزہ نہ لیا جائے۔ ترقی پسند ادب کے سیاسی اور انتہا پسندانہ رویہ کی تنقید محض نظریاتی تعصبات کے سہارے مفید نہیں بلکہ اُس دور کی انتہا پسندی، جذباتی سیاست گری کے تناظر میں فن کاروں کے ذہنی اور عملی رویوں کے ذریعہ چھان بین کی جانی چاہیے۔ تاکہ جمع کیے گئے DATA کو جب ترتیب و تنظیم کی شکل دی جائے تو مبالغہ آمیزی، تعصبات اور تنگ نظری کے ساتھ ساتھ حقیقت بھی اپنی اصلی شکل میں دیکھائی دے۔

اس لیے سماجی سائنس کے ریسرچ اسٹوڈنٹس کے لیے یہ ضروری ہے کہ رویوں کے ذریعہ جو DATA جمع کیا جائے اُس کی پرکھ میں غیر جانب داری برتیں۔ شخصیتوں کے رویوں کو جاننے کے لیے جب استفسار کی نوبت آئے تو زندگی کا صرف ایک پہلو سامنے نہ اُبھرے۔ بہت ممکن ہے کہ ایک قاتل اپنی زندگی کے کسی موڑ پر ادب، موسیقی کا دل دادہ رہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس نے قتل اپنی ناکام محبت یا ناکام آرزوؤں کی خاطر کیا ہو اور وہ اپنی پوری زندگی میں ایک صاف ستھرا فرد ہو۔ اسی لیے رویوں کو جاننے کے لیے اسکالر کو بے حد سنجیدہ، ایمان دار اور باشعور ہونے کی ضرورت ہے۔ معلومات کی سطح بلند اور وسیع ہونی چاہیے۔ رائے عامہ سے واقفیت ضروری ہے۔ برتاؤ اور محرکات کی تلاش و تنقید کے بغیر سروے کا کام پورا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ DATA COLLECTION کے لیے یہ بے حد ضروری ہے۔ یہ ریسرچ کی اہم منزل ہے۔ کیونکہ یہ سوال کا جواب فرد کی ذہنی دُنیا اور لاشعور کی کال کوٹھری سے اس طرح چپکا ہوا ہوتا ہے کہ چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ ریسرچ اسکالر کو چاہیے کہ وہ سمندر میں ڈوب کر سیپیوں کو تلاش کرے اور اگر صدف بے گوہر ملے تو مایوس نہیں ہو بلکہ کوشش تیز تر کر دے۔

رویہ دراصل تصور یا نظریہ کے ذریعہ بہ آسانی پہچانا جاسکتا ہے
اس کو بہت سے آدمی پسند کرتے ہیں بہت سے ناپسند۔ ان دونوں حالتوں
میں ریسرچ اسکالر کو معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔ لہذا رویوں کی
قسموں اور ان کے آپسی رشتوں کا علم بھی ہونا چاہئے۔ اس کے بغیر نہ رویوں
کی شناخت ہوسکتی ہے اور نہ ان سے مفید اور کارآمد نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔
یہی باتیں MOTIVE کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہیں۔ اس کا مطالعہ اور ڈاٹا
حاصل کرنے کی اُمید سروے کا سب سے زیادہ مشکل پہلو معلوم ہوتا ہے۔ اس کا
تصور صرف رویوں کو طے کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ بتائے گئے اسباب وعلل اور
افعال کے لیے بھی ہوتے ہیں۔ سروے کے ذریعہ شخص کی ذات اور اس کے حالات کا
DATA جمع ہوجاتا ہے اور رویوں سے اہم پہلوؤں کی شناخت ہوتی ہے۔
SAMPLING اور سروے کے جائزہ کے بعد اُس کے فوائد اور
اُس کی محدودیت پر نگاہ رکھنی ضروری ہے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ
آبادی کی خصوصیات کا اندازہ بہت ہی کم وقت میں لگ جاتا ہے۔ اس نئے
زمانہ میں وقت کی بہت کمی ہے۔ کم سے کم وقت میں لوگ زیادہ سے زیادہ کام
کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے تحقیق کے لیے بھی زیادہ طویل مدت اچھی بات نہیں
سمجھی جاتی۔ ہر لحہ بدلتی ہوئی دنیا میں سینکڑوں چیزیں ایسی پیدا ہو رہی
ہیں، یا ایجاد کی جارہی ہیں جن کے ذریعہ انسان کو کم وقت میں بہت سے فوائد
حاصل ہوتے ہیں۔ سماجی اور سیاسی حالات کا اندازہ اُس وقت تک
ٹھیک سے نہیں لگایا جاسکتا۔ جب تک اس طریقہ سے نمونوں کی حصول یابی
ممکن نہ ہوجائے۔

دوسرا فائدہ اخراجات میں کمی کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ بہت کم

لوگوں کا انٹرویو لیا جاتا ہے۔ کم افراد کے ذریعہ اعداد و شمار یک جا کیے جاتے ہیں
ٹیبلیشن کوڈنگ میں بھی افراد کی زیادتی نہیں رہتی۔ وہ روپیہ جو سینکڑوں
افراد کے انٹرویو اور اعداد و شمار کی پروسسنگ میں خرچ ہوتے اب تحقیق کے
دوسرے اہم مرحلہ میں خرچ کیے جا سکتے ہیں۔

جب نمونوں کا استعمال ہوتا ہے تو اسکالر کا سارا دھیان ان پر لگا
رہتا ہے۔ وہ ان کی صداقت کی تصدیق بھی کر سکتا ہے۔ اس سے مقالہ کے
معیار کو تقویت ملتی ہے۔ ادبیات میں بھی اس تکنیک سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا
ہے۔ وہ شعری ادب ہو یا افسانوی۔ ہر صنف میں اس تکنیک کی ضرورت
پڑتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اس تکنیک کی ناواقفیت کی وجہ سے
ضروری اطلاعات حاصل نہ کر پائیں۔

کیس اسٹڈی

شاعروں اور افسانہ نگاروں کی شخصیت اور
اُن کی تخلیقات کے تقابلی و تجزیاتی مطالعہ کا فن
ان دنوں اُردو تحقیق کا ایک محبوب موضوع بن گیا ہے۔ مجھے اس کی
محبوبیت پر اعتراض نہیں۔ لیکن میں اپنے اسکالر اور اُن کے نگراں کی توجہ
اس حقیقت کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ تحقیق کی یہ قسم سماجی علوم
سے واقفیت کا براہ راست مطالبہ کرتی ہے۔ سعادت حسن منٹو، عصمت
چغتائی یا ممتاز مفتی کے افسانوی کرداروں کا تجزیہ بغیر گہرے سماجی اور
نفسیاتی شعور کے نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح میرا جی، ن۔ م۔ راشد، اور پھر
جدید شاعری کی خصوصیات اُس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتیں جب تک

علامتوں کا زندگی کے نئے نظام سے کوئی معنوی رشتہ نہ جوڑا جائے۔ شاعرانہ تصور اُسی وقت حسین خوب صورت اور نادر معلوم ہوتا ہے جب وہ الفاظ کی سواریوں کے مناسب اور برمحل استعمال کے ذریعہ پڑھنے والوں کے پاس پہنچے۔ عام فہم الفاظ عوامی زندگی کی روزمرہ کی دین ہوتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شاعر ان الفاظ کو علامتوں کا روپ دینے کی کوشش کرتا ہے تو نہ صرف قطرہ کو دجلہ میں سموتا ہے بلکہ تجربات و حوادث کو نئی تخلیقی شکل میں بھی پیش کرتا ہے۔ اُس کا یہ تخلیقی عمل اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ تحقیق کے دوران علامتوں، تشبیہوں اور الفاظ کے خزانوں میں پوشیدہ حقائق کا تجزیہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان مخصوص الفاظ اور علامتوں کو شاعر نے کیوں استعمال کیا اور اُن کے مترادفات کو ترک کس لیے کیا۔ غالب اور اقبال کی شاعری اس کی بے حد عمدہ مثالیں ہیں۔ غالب کے یہاں بعض حرف صرف صوتیاتی حسن کی خاطر پیش نہیں ہوئے بلکہ انھیں اگر یکجا کر دیا جائے اور تشریح و تجزیہ کی نازک ترین منزلوں سے گزرا جائے تو اُن میں ایک خاص ذہنیت پوشیدہ نظر آئے گی ایک ایسی آرزومندی دکھائی دے گی جس کا غالب کی شکست و فتح سے گہرا رشتہ ہے۔ اسی طرح اقبال کے یہاں بھی الفاظ کا تجزیہ ایسے جہانِ معنی پیدا کرے گا جس کی طرف ابھی لوگوں نے سوچا بھی نہیں۔ ان شعرا پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ سوانحی خاکوں اور تاریخی حالات کی روشنی میں ان کی شاعری کا مطالعہ کریں اور زبان کی شیرینیت، روانی اور دوسری خصوصیات کو تھوڑی دیر کے لیے بھول کر یہ دیکھیں کہ کیا ان کے ذولیہ کوئی کیس اسٹڈی بھی بنتی ہے۔ مثلاً غالب کیوں اکثر و بیشتر

اندیشہ ہائے دور ودراز' کی بات کرتے ہیں۔ کیوں حسرتوں کی تکرار ہوتی ہے، کیوں شکستِ نالۂ دل کی صدا سناتے ہیں۔ یہ سب محض محرومیت اور ناقدری یا محبوب کی بے التفاتی سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس طرح کے اشعار کی مدد سے ہم اپنے کلاسکی اور جدید شاعروں کی کیس اسٹڈی تیار کر سکتے ہیں، اُن کے ذہن کو سمجھ سکتے ہیں۔ اُن کی خوشیوں اور غموں کا زیادہ بہتر تجزیہ اور ان کی عظمتوں کا ادراک کر سکتے ہیں۔

یہی باتیں افسانوی ادب کا جائزہ لیتے وقت بھی ضروری سمجھی جاتی چاہئے۔ کیوں کہ افسانوی ادب میں کرداروں کے ذریعہ تجربات وحوادث بیان ہوتے ہیں۔ کرداروں کا عمل منفی اور مثبت دونوں ہوتا ہے۔ ایک ہی آدمی عالمانہ گفتگو بھی کرتا ہے اور رکشا والوں کی طرح گالیاں بھی بکتا ہے۔ ایک مولوی منبرِ رسول پر بزرگوں کے فضائل بھی بیان کرتا ہے اور خلوتوں میں اپنی جنس زندگی کے ایسے کرتب بھی دکھاتا ہے کہ آنکھیں حیران وششدر رہ جاتی ہیں کہ "دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں" اب افسانہ میں اگر ایسے کردار موجود ہیں تو اُن کی کیس اسٹڈی دلچسپ اور معلوماتی ہوگی۔ یہاں افسانوی ادب کے تحقیقی اور تنقیدی جائزہ کی رہ نمائی مختلف سماجی علوم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

کیس اسٹڈی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص، خاندان، برادری یا قوم کی زندگی کے متعلق اُن تمام پوشیدہ اور غیر پوشیدہ خصوصیتوں کی دریافت کی جائے، اُن کا تجزیہ کیا جائے جن کی وجہ سے اُن کی شناخت ممکن ہوتی ہے۔ یہ شناخت زیادہ تر اُن رویوں کے ذریعہ ہوتی ہے جو اشخاص کی طرزِ زندگی، حسنِ سلوک، عمل اور ردِّ عمل کے ذریعہ ظاہر ہوتی رہتی ہیں اور ان کا ماحول سے ربط بڑا گہرا ہوتا ہے۔ اس کے لیے جوڑا تا۔ جمع

کیا جاتا ہے اُس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص یا اکائی کی فطری تاریخ مرتب کی جائے۔ اُس کے سماجی اسباب اور واقعات سے رشتہ جوڑا جائے، جو اُس کے مخصوص ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ BURGESS کیس اسٹڈی کے طریقہ کار کی اہمیت بیان کرتا ہے اور اُس کے ذریعہ جو ڈاٹا حاصل کیے جاتے ہیں اُنھیں SOCIAL MICROSCOPE کے نام سے پکارتا ہے۔

کیس اسٹڈی کا سماجی تحقیق میں سب سے پہلی بار FREDRICK LEPLAY نے استعمال کیا۔ مشہور فلسفی HERBERT SPENCER نے بھی اسے کلچر کے تقابلی مطالعہ کی خاطر طریقۂ کار میں لایا تھا۔ دوسرے ماہر نفسیات نے اعصابی اور ذہنی امراض کے مریضوں کی شفا کی خاطر کیس اسٹڈی تیار کرنا شروع کیا تھا۔ خاص کر WILLIAM HEALAY نے اس کی اہمیت کو عام کیا پھر ماہر بشریات اور سماجیات نے اس کارآمد طریقہ میں مضمر تحقیق کی خوبیاں تلاش کیں۔ کلچر کے مطالعہ کے لیے بھی اب اس کا استعمال عام ہوگیا ہے۔ لیکن اُردو ادب میں ابھی تک اس کا آغاز بھی نہیں ہوا ہے۔ یہی نہیں بہت سے ذہنوں کو تحقیق اور کیس اسٹڈی کے درمیان ربط کی تلاش بھی مہمل معلوم ہوگی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اُردو کے اساتذہ کرام کا وہ مزاج ہے جس پر ایک طرح کی غزلی ذہنیت اور دقیانوسی طرز فکر حاوی ہے۔

اس وقت تمام سماجی علوم کے ماہرین کیس اسٹڈی کو تحقیق کے کارآمد اور مفید نتائج حاصل کرنے کے لیے بے حد مؤثر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مغرب کے مشہور ادیب و شاعر خاص کر ڈرامہ نگار اور ناول نگار اپنے موضوع کے پیش نظر کرداروں کی ساخت، فطرت اور اُن کی جبلتوں کے پیش نظر

افراد کے کیس اسٹڈی میں اتنی ہی دل چسپی لے رہے ہیں جتنی ایک ڈاکٹر اپنے بیماروں میں لیتا ہے۔ تحقیق کا یہ طریقہ کار علم سماجیات میں اُس وقت مقبول ہوا جب THE POLISH PEASANT شائع ہوئی۔ اسے دو افراد نے تخلیق کیا۔ یہ THOMAS , ZNANIEKI تھے۔ یہ لوگ اپنی تحقیق کے دوران، افراد کی نجی زندگی کا مطالعہ، سوانحی خاکوں، سوانح عمری، تاریخی دستاویز کے ذریعہ افراد کے حقیقی اعمال تک پہنچے۔ انھوں نے فرد اور افراد کا انفرادی اور مجموعی جائزہ لیا، اور مختلف النوع انسانوں کی کیس اسٹڈی تیار کی، اس میں خطوط اور ڈائری کے ذریعہ بھی مدد لی گئی۔ تاکہ حقیقت اپنی اصلی شکل و صورت میں نظر آئے۔ ان دونوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تجربات کی روشنی میں مختلف افراد پر مخصوص تجربوں کے رد عمل کا بھی مطالعہ کیا۔ اُن کی جذباتی زندگی کے تاروں کو چھیڑا اور جن نتائج سے وہ دوچار ہوئے اُنھیں نہایت دیانت داری سے قلم بند کیا۔ اور یہ رائے ظاہر کی کہ کیس اسٹڈی کے ذریعہ صرف حقیقی اشیا کا ہی علم ہو سکتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی مبالغہ آمیزی کی گنجائش نہیں۔ اس لیے سماجی علوم کی تحقیق میں اس کی شمولیت بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ اسی کیس اسٹڈی کی بنیاد پر مشہور ماہر علم بشریات FRANZ BOAS نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انسان کی فطرت خواہ وہ کہیں کا ہو ایک جزو ہے اُس کُل کا، جو ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔

انسان خواہ کسی ملک کا، یا قوم کا ہو، ذہنی تناؤ میں مبتلا رہتا ہے۔ کہیں اس کی نوعیت معاشی ہوتی ہے، کہیں سیاسی، کہیں علمی، کہیں جنسی۔ کوئی شخص آج تناؤ سے آزاد نہیں ہے۔ اب ماہر علم الانسان کے نزدیک اس تناؤ کی

نوعیت کا جاننا ضروری ہے تاکہ وہ اپنی تحقیقی منزلوں سے آگے بڑھ کر نتائج کی حدود میں داخل ہو۔ اسی لیے ماہر نفسیات G.W. ALLPORT کہتا ہے کہ انسان کے اندر پوشیدہ چھپے ہوئے انسان کو جاننے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کی کیس اسٹڈی ترتیب دی جائے۔

اب اس کیس اسٹڈی کو ترتیب دینے یا اس طریقہ کار کو کام میں لانے کے مختلف طریقے ہیں۔ NEL ANDERSON نے HOBOS قبیلہ سے وابستہ افراد کی نجی زندگی سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے شاعری، نغموں، گیتوں اور دوسرے بہترین وسیلوں کا انتخاب کیا۔ اس نے ہوبوس کی تصویریں چھاپیں، اُن کی زندگی کو غور سے دیکھا، ان کے کلچر اور تہذیبی اداروں کی شناخت کی اور اس کی تمدنی زندگی کو بے نقاب کیا، جس کے متعلق ابھی تک لوگوں کی واقفیت واجبی تھی۔

JOHN DOLLARD نے حسب ذیل معیار اور اصول و ضوابط کی روشنی میں کیس اسٹڈی کی ضرورت پر زور دیا ہے:-

(۱) کلچر تہذیب اور ادبی موضوعات کی تحقیق ایسی حقیقت کا مطالبہ کرتی ہو جس میں افراد، برادری یا جماعت کے انفرادی یا مجموعی رویوں اور برتاؤ کا تجزیہ بہ آسانی کیا جا سکے۔ اقدار کی بازیافت، تعین قدر کے مسائل اور تمدنی زندگی کے نظام کی پرکھ بھی مقصود ہو تو کیس اسٹڈی کی ضرورت ہو سکتی ہے۔

(۲) اس کے ذریعہ حاصل کی گئی اطلاعات سماجی زندگی کے لیے معنویت رکھتی ہو، اور مخصوص سماجی زندگی کے رویوں اور سلوک کا مطالعہ پیش نظر ہو۔

(۳) خاندان اور برادری کی حیثیت کا جائزہ مخصوص افراد کے کیس اسٹڈی کے ساتھ اُبھرتا ہو۔

(۴) افرادی کیس اسٹڈی کے ذریعہ صحت مند نتائج کی توقع رہتی ہے۔

(۵) عالم طفولیت سے عمر کی آخری منزل تک کا مطالعہ ضروری سمجھا گیا ہو اور اس کے تمام تجربات نتائج کے لیے ضروری تصور کیے گئے ہوں۔ اس اسٹڈی کے ذریعہ تواتر سے واقعات اور سانحات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تاکہ شخصیت کے ارتقا اور نشو و نما میں جو اسباب وعلل کارفرما رہے ہوں اُن کی پہچان کی جا سکے۔

(۶) فرد کی سماجی حیثیت اور نوعیت مطالبہ کرتی ہو۔

(۷) سوانح عمری، سوال نامہ، ڈائری، خطوط غرض تمام ذرائع اس طرح کیس اسٹڈی کے سلسلہ میں استعمال کیے جائیں تاکہ کوئی واضح تصور مفروضہ یا نظریہ کی تصدیق یا تردید ہو سکے۔

DOLLARD نے مذکورہ بالا شرائط کو کیس اسٹڈیز کی ضرورت کے سلسلہ میں ضروری تصور کیا۔ لیکن ان پر عمل کرنا سو فیصدی ممکن نہیں۔ انسان اس قدر پیچیدہ مخلوق ہے کہ اُس کے نظریوں، تصورات اور عمل کی دُنیا میں وحدانیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ اگر کوئی اسٹڈی حاصل کی جائے تو انسان کی تہذیبی، مذہبی، سیاسی اور سماجی زندگی کے نہاں خانوں تک محقق کی رسائی ہو سکتی ہے اور یہ رسائی ایک ذہین اسکالر کو اتنا مواد فراہم کر سکتی ہے کہ وہ بہت آسانی کے ساتھ

عصمت، منٹو، بیدی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی جیسے افسانہ نگاروں کے کرداروں کا تجزیہ بخوبی کرلے۔ یہ تجزیہ صرف کرداروں کی زندگی تک محدود نہ ہوگا بلکہ ان مصنفوں کے ذہنوں کو بھی سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔ مشہور ماہر نفسیات GARDON ALLPORT نے کیس اسٹڈی کے سلسلہ میں اُن اعداد و شمار سے بھی بحث کی ہے جو اسکالر کی دشواریوں کو اور آسان بنا دے سکتے ہیں۔ دراصل ان اطلاعات کے ذریعہ معلومات کی وہ دنیا حاصل ہو جاتی ہے جسے ہم CODIFIED KNOWLEDGE کہہ سکتے ہیں۔

اُردو ادب میں ابھی اس کی ابتدا نہیں ہوئی۔ لیکن جن دانش گاہوں میں اُردو ادب سماجی علوم کے تناظر میں پڑھایا جاتا ہے وہاں کا نصاب یقینی طور پر ایسا ہونا چاہیئے جس کے ذریعہ تقابلی تحقیق کے مسائل سامنے آسکیں اور جدید سماجی علوم میں تحقیق کن منزلوں سے گذر رہی ہے اور اُس کے طریقۂ کار کیا ہیں، اُردو ادب کے اُستاد اور طالب علموں کو اس کی خبر ہونی چاہیئے اگر اس کی طرف غفلت برتی گئی تو ہماری ساری توجہ داغ کی شاعری میں دال کی اہمیت پر مرکوز رہے گی اور تحقیق کی نئی روشنی سے ہم فیض یاب نہ ہوسکیں گے۔

باب پنجم

تحقیق کے آلات

سوال نامہ بہت سی کتابوں میں اہلِ قلم حضرات نے سوال نامہ اور گوشوارہ کو مترادف الفاظ سمجھ کر استعمال کیا ہے لیکن تکنیکی اعتبار سے ان میں بڑا فرق ہے۔ سوال نامہ میں بہت سے سوالات ہوتے ہیں جو طبع زاد ہو سکتے ہیں یا ٹائپ یا سائیکلو اسٹایل کا پیاں ہوتی ہیں۔ یہ ڈاک کے ذریعہ مختلف افراد یا کسی ایک فرد کو بھیجی جاتی ہیں اور اُن سے گزارش کی جاتی ہے کہ وہ ان کا مطالعہ کریں اور جواب ارسال کرنے کی زحمت فرمائیں۔ گوشوارہ یعنی شیڈول کا بھی ایک فارم بنا ہوتا ہے جس میں سوالوں کی لسٹ بنی ہوتی ہے۔ اسکالر اس پروفارمہ کے ذریعہ سوالات کرتا ہے اور اس کی ترتیب ہوتی ہے۔ پھر جوابات کو نوٹ کرتا ہے۔ کبھی کبھی جواب دینے والے کو شیڈول سونپ دیا جاتا ہے تاکہ وہ خانہ پری کے بعد واپس کر دے۔ اس دوران وہ بعض باتوں کی تشریح بھی کر سکتا ہے اور جواب دینے والا وضاحت طلب کرتا ہے۔

تحقیق کے اس طریقۂ کار کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ DATA بہت سے

ذرایع سے جمع ہو جاتا ہے اور مختلف طبقہ کے افراد سے جو اپنے مزاج، طبیعت، علم اور مصروفیات کی وجہ سے ایک نہیں ہوتے اسکالر سے رابطہ پیدا کر لیتے ہیں۔ اس وجہ سے JOHN GALTING نے اسے

'WRITTEN VERBAL STIMULUS
WRITTEN VERBAL RESPONSE

کہہ کر پکارا ہے۔

گزشتہ صفحات میں رویوں کے متعلق لکھتے ہوئے میں نے اس کی وضاحت کی تھی کہ DATA کے حصول میں اس کے ذریعہ کبھی کبھی ناکامی بھی ہوتی ہے اور صحیح باتیں معلوم نہیں ہوتیں۔ یا جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اتنی محدود ہوتی ہیں کہ ریسرچ اسکالر کا کام نہیں چلتا۔ نہ فرد کے جذبات و احساسات کا اندازہ ٹھیک سے ہو پاتا ہے، نہ ذاتی عقائد پر اچھی طرح روشنی پڑتی ہے اور نہ اس کے مستقبل کے پلان کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ پھر اُس کا ماضی اور مستقبل دونوں ہی تاریکی میں رہتا ہے۔ کیوں کہ مشاہدہ صرف حال کا ہو سکتا ہے، ماضی کا نہیں، البتہ مستقبل کا ممکن ہے۔

سوال نامہ چونکہ بہت سے سوالوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور ایک خاص ترتیب میں تدوین کیا جاتا ہے اور اسے مختلف افراد کے پاس بھیج دیا جاتا ہے اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ جوابات واضح اور تفصیلی ہوں گے کیوں کہ ان کے مطالعہ کے بعد ہی جواب دینا ممکن ہوگا۔ یہ جوابات بغیر کسی آدمی کی مدد کے بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں بنیادی طور پر فرد واحد تمام باتوں کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

سوال نامہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ DATA جمع کرنے میں نہ صرف آسانی ہوتی ہے بلکہ اعداد و شمار کا سرمایہ بھی خاصا بڑا ہو جاتا ہے۔ اس میں تنوع ہوتا ہے اور اس کی دُنیا وسیع ہوتی ہے۔ معروضیت اور کمیت کے اعتبار سے بھی اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

بعض علوم کے ریسرچ میں یہ واحد موثر طریقۂ کار ہے، جس کے ذریعہ حقیقتوں کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔ اس طرز کے جواب میں جو رپورٹ درج ہوتی وہ لایق اعتبار ہوتی ہے۔ اس کا تجزیہ بھی کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ جن موضوعات کے متعلق کوئی شخص سوال نامہ بھر کر بھیجتا ہے وہ بالکل اچھوتے نہیں ہوتے۔ اُن سے متعلق مضامین اور علم کا سرمایہ پہلے سے موجود رہتا ہے جن کی روشنی میں جوابات کی پرکھ آسان ہو جاتی ہے۔ سوال ناموں سے صرف مواد حاصل ہوتا ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس کے بعد ان کی PROCESSING نہیں ہوتی اور ان کی حیثیت حرف آخر ہے۔

سوال نامہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ افراد اسے سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ ——— اور بہت سے اسباب کے پیش نظر زیادہ تر خاموش رہتے ہیں اور جواب نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکالرس کو حقیقتوں کا علم نہیں ہو پاتا اور اُس کی معلومات تشنہ رہ جاتی ہیں۔ لیکن اس کے تجزیہ کا شعور اعلیٰ ذہنی اور علمی سطح کا متقاضی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو خود احتسابی کی منزلوں سے گذرتے ہیں اور جنھیں توفیق ہوتی ہے کہ وہ سوال نامہ کے جوابات ایمان داری سے دیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوال نامہ اکثر و بیشتر جوابات کے محتاج رہ جاتے ہیں اور اسکالرس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ مگر اس میں پوشیدہ فائدوں کو بھی

نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(۱) چوں کہ سوال نامہ بذریعہ ڈاک بھیجا جاتا ہے۔ جس میں اُن سوالات کی تفصیل درج ہوتی ہے جن کا تعلق تحقیق کے موضوع سے ہوتا ہے۔ اس لیے مزید کسی تشریح اور وضاحت کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے لیے کسی خاص ہنر اور تکنیک کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس ساری باتیں موضوع کے گرد گھومنی چاہئے۔

(۲) سوال نامہ کا ادب میں بھی چلن رہا ہے۔ اگر کسی ایک فرد کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام ہو رہا ہے تو اُس فرد کے پاس سوال نامہ ارسال کیا جاتا ہے۔ پھر مزید معلومات کے لیے اُس موضوع سے متعلقہ افراد کو روانہ کیے جاتے ہیں۔ یہ عمل ایسا ہے کہ اس میں سفر کی صعوبتیں بھی نہیں ہوتیں اور نسبتاً اخراجات بھی کم ہوتے ہیں۔ ملک کے دور دراز علاقوں میں جانا اسکالر کے ممکن نہیں۔ اس لیے سوال نامہ کے ذریعہ مواد کی فراہمی بہت آسان طریقہ ہے۔

(۳) سوال نامہ ایک ایسا طریقہ' کار ہے جس میں اسکالر کی اپنی ذات ملوث نہیں ہوتی۔ اسے غیر ذاتی طریقہ' کار بھی کہا جاتا ہے۔ البتہ ان کا معیار یکساں ہوتا ہے۔ اس میں وحدانیت پائی جاتی ہے۔ حالاں کہ نفسیاتی نقطہ' نظر سے اس یکسانیت سے نقصان کا اندیشہ ہے یعنی جوابات سو فی صدی درست نہیں ہو سکتے اور اُن کے معنوں میں بھی فرق پیدا ہو سکتا ہے۔ انٹرویو میں شکوک و شبہات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اگر کوئی گوشہ پیدا بھی ہوتا ہے تو فوراً اسے دریافت کر لے سکتے ہیں۔ مگر سوال نامہ میں مجبوری ہوتی ہے۔

خط وکتابت کے ذریعہ شکوک و شبہات کو دُور کرنا ممکن نہیں ہے۔

(۴) اس کی ایک بڑی صفت یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ مخفی رہتا ہے۔ کوئی دوسرا شخص کسی جواب دینے والے کے متعلق نہیں جان سکتا۔ اور وہ اپنے جواب میں اپنی شخصیت کے بے نقاب ہونے سے خوف نہیں کھاتا کیوں کہ اُسے اسکالر کی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ لہذا بلا خوف و خطر وہ آزادانہ رائے کا جب چاہے اظہار کرسکتا ہے۔

(۵) سوال نامہ فرد کو فوری جواب کے لیے مجبور نہیں کرتا، مگر اِنٹرویو میں جواب فوراً دینا پڑتا ہے۔ وہ سوال نامہ کو بہ غور پڑھ سکتا ہے، اُن پر غور کرسکتا ہے پھر جواب لکھ سکتا ہے۔ یا اگر سوال نامہ جلد بھیجنے کی تاکید کی گئی ہے تو بھی وہ غور و فکر کی راہوں سے گذرنے کا موقع ضائع نہیں کرتا۔ یعنی کسی حال میں وہ ذہن کی ترنگ کا مظاہرہ نہیں کرسکتا اور ذمہ دارانہ تحریری جواب بھیجتا ہے۔

سوال نامہ کا ڈیزائن

سوال نامہ اور شیڈول یعنی گوشوارہ دو مقاصد کی خاطر تیار کیے جاتے ہیں:۔

ا۔ تحقیق کے بنیادی مقاصد کو سوالوں میں پوشیدہ کردیا جاتا ہے۔ جس کے جواب میں مواد کی فراہمی ہو جاتی ہے۔ اس سے مفروضات کی تعمیر اور ساخت کی تعمیر میں مدد ملتی ہے اور ریسرچ کے لیے نئے گوشے بھی واہو جاتے ہیں۔ اس لیے بار بار نگراں تاکید کرتا ہے کہ سوالوں کا

موضوع کے دائرہ اور اُس کے مقاصد سے گہرا رشتہ ہونا چاہیے۔
اسی طرح ہر سوال کے جواب کا مناسب تجزیہ یہ ضروری ہو جاتا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ مقصد کی برآوری ممکن ہوئی یا نہیں۔ سوال نامہ بھیجتے وقت اسکالر کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ جن سے جواب کی توقع ہے۔ وہ اس کا اہل ہے یا نہیں۔ اُن کی اپنی کوئی رائے ہے یا وہ یونہی ہے۔ اس لیے ہر سوال کے جواب سے جواب دینے والے کی شخصیت، علم، تجربہ اور آگہی کا احساس ہونا ضروری ہے۔

سوال نامہ کا دوسرا کام یہ ہے کہ جواب دینے والے کے لیے وہ محرک کا کام کرے تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر سکے اور سوال نامہ کو ردی کی ٹوکری میں نہ ڈال دے۔ لیکن ہمارے ریسرچ اسکالر اس طریقہ سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ اور اُمید نہیں کرتے کہ مواد کی فراہمی آسانی سے ہو جائے گی۔

سوال ناموں کی زبان آسان اور عام فہم ہونی چاہیے۔ ادق الفاظ یا صرف اصطلاحوں کی بھرمار بھی اچھی چیز نہیں۔ بلکہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ جس کے پاس سوال نامہ بھیجا جا رہا ہے اُس کی زبان استعمال ہونی چاہیے یعنی یہ شعور ہونا چاہیے کہ سوال نامہ کی زبان صاحبِ جواب کے لیے نافہم نہیں ہے۔ سوالوں کی نوعیت بھی ایسی ہونی چاہیے کہ صاحبِ جواب کے لیے اُسے سمجھنا اور اُس میں دلچسپی لینا ضروری ہو جائے۔ ہر سوال محض اسکالر کو اپنی آسانی کی خاطر نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ جواب دینے والے کی دلچسپی اور اس کی صلاحیتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

ایسے سوالوں سے بھی گریز کرنا ضروری ہے جو جذبات کو مجروح کرتے ہوں۔ جن سے عقاید کو ٹھیس لگتی ہو۔ اگر ان کے عقاید کا علم حاصل کرنا ضروری ہے تو سوالوں کی نوعیت بدلنی پڑے گی۔ ورنہ سوال نامہ غیر سائنسی ہو جائے گا۔ اور اسکالر کے اغراض و مقاصد پورے نہیں ہوں گے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ سوالوں میں کوئی غیر عملی، غیر حقیقی مفروضات شامل نہ ہوں۔ یعنی اطلاعات کی سطح معیاری ہونی چاہئے اور جواب دینے والے کی بساط سے باہر کی باتیں نہ ہوں۔ اگر وہ کوئی جواب نہ دے پائے تو سوائے خفت و ندامت کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس لیے اس امر کا لحاظ ہر حال میں رکھنا ہے۔

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھنا چاہئے کہ آرٹس کے پروفیسر یا ادیب سے یہ سوال پوچھا جائے کہ ایٹم بم بنانے کے طریقے کیا ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اس کے جواب سے قاصر ہوگا۔ اس طرح کی باتیں اسکالر کے ذہنی دیوالیہ پن کا بھی ثبوت ہوں گی اور اس کے نگراں پر بھی حرف آئے گا۔

اس لیے سوالوں کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے کہ جواب دینے والے کو کسی شرمندگی یا خوف کا احساس نہ ہو۔ یعنی اس کے جواب کا مضحکہ اڑانے کی نوبت نہ آنے پائے۔ مشکل سے مشکل سوال کو بھی اس طرح پوچھنا چاہئے کہ جواب میں کوئی قباحت نہ ہو۔ سوالوں کا تسلسل برقرار رہنا ضروری ہے۔ یہاں خیالات میں برہمی یا انتشار کی کیفیت سے گریز کرنا ہے ورنہ ان کے تجزیہ میں دشواری ہوگی۔

عام طور سے سوال نامہ میں کئی موضوعات شامل رہتے ہیں۔ اس سے مشکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے اسکالر کو چاہئے کہ وہ اپنے موضوع کے تحت سوالوں کو ترتیب دے اور بھٹکنے سے خود کو محفوظ رکھے۔

عام طور سے OPEN QUESTION اور CLOSED QUESTION کے سلسلہ میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن یہ غلطی ہے۔ سوالوں کی ہیئت کے سلسلہ میں ان میں فرق کرنا بھی ضروری ہے۔

کھُلے (OPEN) سوالوں سے بڑے فائدے ہیں۔ کیوں کہ اس میں جواب دینے والے کو اس کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنی فکر اور جدتِ طبع کے مطابق جواب دے۔ اس سے فرد کی صلاحیت اور ذہانت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ 'بند سوالوں' میں یہ صفات نہیں ہوتیں۔ کوڈنگ کے طریقوں میں اس سے آسانی ہوتی ہے۔

سوال جو پوچھے جاتے ہیں انھیں تین خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔

(۱) IDENTIFYING INFORMATION کیس سے متعلق سوال نامہ، کراس ریفرنس، سروے کا نام، اُس ایجنسی کا نام جو سروے کرتا ہے، آدمی یا خاندان کا نام جس سے اطلاعات حاصل کی جارہی ہیں۔ اُن کی جنس، فطرت، مزاج، طبیعت وغیرہ بھی شامل ہیں۔

(۲) SOCIAL BACK GROUND AND FACTUAL DATA اس میں حسب ذیل باتیں دریافت طلب ہوتی ہیں۔ فرد کی عمر، فیملی کے بزرگوں کی عمر، ایک خاص عمر کے افراد کی تعداد، دوسرے گھر والے، مذہب، تعلیم، شادی شدہ یا غیر شادی شدہ، سیاسی نظریات، تحریکوں، انجمنوں سے فرد کی دلچسپی، خاندان یا فیملی کی تعداد فیملی کی آمدنی اور سماجی و معاشی فضیلت۔

(۳) SUBJECT MATTER OF SURVEY

اس میں فرد سے براہ راست سوالات کیے جاتے ہیں جنھیں وہ جانتا ہے
یا یادداشت میں محفوظ ہیں۔

WILKINSON نے سوال ناموں کے سلسلہ میں مزید بہت سی باتیں
لکھی ہیں۔ جن کی اہمیت سماجی علوم میں ادب سے زیادہ ہے۔ لیکن نگراں کو
ان باتوں کی واقفیت ہونی چاہیے۔ ورنہ وہ اصول تحقیق سے نابلد تصور کیا
جائے گا۔ اس لیے اُسے چاہیے کہ سوال نامہ کا ڈیزائن بھی خود ہی بنا دے۔
اس کا انتخاب بھی ایسا ہونا چاہیے کہ موضوع کا کوئی پہلو ادھورا اور تشنہ نہ
رہے۔ سوال نامہ کی شکل و صورت بھی قابل لحاظ شئے ہے۔ سلیقہ اور نظم کی کمی کی
وجہ سے اکثر و بیشتر لوگ ڈاک سے بھیجے گئے سوال نامہ کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن
اگر اس کی طباعت یا ٹائپ کاپی دیدہ زیب ہے، اچھے کاغذ کا استعمال ہوا
ہے تو پڑھنے والا دل چسپی لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کا جواب دے۔
سوالوں کے سلسلہ میں ایک بات شروع میں بتائی گئی ہے کہ شیڈول
اور سوالوں میں بڑا فرق ہے۔ یہ اسکالر خود ہی بھر دیتا ہے۔ جب کہ سوال
نامہ، جواب دینے والا بھر کر بھیجتا ہے۔ شیڈول کا فارم بھی مختلف ہوتا ہے۔
سوال نامہ اپنی ہیئت، سائز اور طباعت کے اعتبار سے خوش نما
ہونا چاہیے۔ حالاں کہ اس کا تعلق موضوع کی نوعیت سے ہوتا ہے۔ پھر بھی
اسکالر خوش سلیقگی کا اظہار کر سکتا ہے۔
بعض اسکالر اس کی خاطر سوال نامہ کو مختلف رنگوں میں چھپواتے
ہیں۔ شیڈول کا کاغذ سوال نامہ سے عمدہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ اسے کئی ہاتھوں
سے گزرنا ہوتا ہے۔ بہر حال یہ عناصر ایسے ہیں جن کے ذریعہ DATA فراہم ہوتا ہے

اور جب اس کا سرمایہ خاصا ہو جاتا ہے تو اس کے تجزیہ کی منزل آتی ہے۔

اقتباسات

مقالہ کا قاری عام قاریوں سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ اسکالر کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کیوں کہ اس کے پاس مختلف سماجی علوم کی آگہی اور بصیرت بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا بے جا اقتباسات، مقالہ نگار کے لیے کوئی اچھی بات نہیں۔ اُسے علمی سطح پر بے حد ایمان دار ہونا چاہیے۔ کیوں کہ نہ اس کے بغیر اچھی تحقیق کی جا سکتی ہے اور نہ وہ اپنی پہچان کا کوئی نقش ثبت کر سکتا ہے۔

ریسرچ کے دوران اسکالر مختلف کتابوں اور جرائد سے نوٹس لیتا ہے اور عام طور پر اُسے تھیسس کی ضخامت کی خاطر استعمال کرتا ہے۔ کم از کم اردو میں یہی ہوتا ہے۔ اقتباسات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کا استعمال اُسی وقت ہونا چاہیے جب اسکالر یہ سمجھے کہ کسی مصنف کا اقتباس اُس کی عبارتوں اور تصورات کی پیش کش سے بہتر طور پر اُس کے مفروضات اور دلیلوں کو ثابت کرتا ہے۔ یا پھر دستاویزی شہادت کے لیے ضروری ہے۔ یا جب ریسرچ اسکالر اُس کی کسی رائے سے انحراف کرتا ہو، یا جہاں اعداد و شمار کے بیان میں ٹکراؤ ہو، یا کہیں بنیادی اصولوں میں اختلافات ہوں۔ یہی نہیں اگر کسی غیر مطبوعہ مسودہ کی عبارت نقل کرنی ہو اور عبارت نویس بقید حیات ہو تو اُس کی اجازت لینی ریسرچ کے اخلاقی آداب میں شامل ہے۔ پھر اقتباسات کی صحت کو دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اسکالر واقعی عبارت کی زبان استعمال

کر رہا ہے۔ کہیں ایسا نہیں کہ وہ کسی مصنف کے مرکزی تصورات کو اپنے الفاظ میں پیش کر رہا ہے۔ ان تمام باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اسکالر کو موضوع سے متعلق سینکڑوں کتابوں، رسائل و جرائد کے مطالعہ کے دوران کثیر تعداد میں اقتباسات کارڈ یا کاغذ پر نوٹ کر لینا چاہئے اور جب مقالہ لکھنے کی منزل آئے تو اُسے بے حد ہوشیاری کے ساتھ اُن ضابطوں کا خود کو پابند بنا لینا چاہئے جن کا سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے۔

بہت زیادہ اور غیر ضروری اقتباسات اچھے مقالے کی پہچان نہیں۔ طویل اقتباسات سے قاری خواہ وہ ایگزامنر ہو' یا اسکالر' یہ بھول سکتا ہے کہ یہ خیالات کن کے ہیں۔ یعنی تفہیم میں رکاوٹ اور پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لیے اُن اصولوں اور ضابطوں کا خیال رکھنا ہر صاحب فہم کے لیے ضروری ہے، جس کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے :—

(۱) اقتباسات کا براہ راست استعمال وہیں زیب دیتا ہے، جہاں اسکالر یہ یقین کرلے کہ کسی مخصوص عبارت سے زیادہ اچھی طرح وہ خود اس میں بیان کی گئی باتوں کو نہیں لکھ سکتا۔ اس میں اختصار کا حُسن بھی ہے اور وہ قابل قبول بھی ہے۔

(۲) اگر مقالہ میں کسی دستاویزی شہادت کی ضرورت آگئی ہے اور صرف فٹ نوٹس سے کام نہیں چل سکتا تو ضروری عبارت کو بڑی احتیاط کے ساتھ شامل کرنا چاہیئے۔

(۳) اگر اسکالر کسی مصنف یا اہلِ قلم حضرات کے بعض مفروضات کو غلط سمجھتا ہے، یا اُس کی تردید کرنا چاہتا ہے اور اُس کے پاس دلائل وقیع ہوں ہوں تو وہ براہ راست اقتباسات پیش کر سکتا ہے۔

(۴) اگر کسی مضمون میں پیراگراف کی تبدیلی سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے یا جو مفہوم لکھنے والے کا ہو وہ پورا نہ ہوتا ہو تو حقیقی عبارت کی نقل سے وہ اس اُلجھن کو دُور کر سکتا ہے۔

(۵) سائنسی اور دوسرے سماجی علوم کی تھیس اور مقالوں میں ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ وہاں اصول، فارمولے اور نتائج اپنی اصلی شکل میں نقل کیے جائیں۔ یہاں مجبوری ہے اور اقتباسات خواہ کتنے طویل کیوں نہ ہوں ضروری ہو جاتے ہیں۔

یہ باتیں تو اس ضمن میں ہوئیں کہ اقتباسات جہاں تک ممکن ہو، فہم و فراست کے ساتھ استعمال کیے جائیں۔ لیکن بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں اُس کے بغیر مقالہ یا تھیس مستند اور وقیع نہیں سمجھی جائے گی۔ ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔

اقتباسات کی نقل کے سلسلہ میں اس امر کے لیے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ:

(۱) کسی مصنف یا سرکاری مطبوعات کی مخصوص زبان نقل کی جائے

اور کسی حال میں بھی اپنے الفاظ میں مصنف یا سرکاری دستاویز کے تصورات نہ پیش کر دیئے جائیں ۔ خاص دھیان اس بات پر دینا چاہیئے کہ جہاں جہاں کاما، فل اسٹاپ جو بھی استعمال ہوتے ہوں انھیں بعینہ رکھ دیا جائے ۔ یعنی عبارت کی اصلیت بے حد ضروری ہے ۔

(۲) اگر کسی عبارت کی نقل میں کوئی گرامر کی تکنیکی دشواری حائل ہو جاتی ہے اور INTERPOLATION سے نجات ممکن نہیں تو اُس کی نشان دہی کوئی مخصوص نشان بنا کر کر دینی ضروری ہے تاکہ پڑھنے والے سمجھ سکیں کہ اصل الفاظ کی جگہ یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے ۔

اقتباسات کو نقل کرنے کی بھی ایک تکنیک ہوتی ہے ۔ بدقسمتی سے ہمارے اساتذہ کرام نہ خود اس کی طرف توجہ دیتے ہیں اور نہ اپنے اسکالر کو اس عمل کے لیے تیار کراتے ہیں ۔

اقتباسات کی بنیادی ہیئت عام طور پر اُس کی طوالت پر منحصر ہے ۔ اس لیے ریسرچ کے ماہرین نے اسے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے : ۔

(۱) پہلی شکل بہت مختصر ہوتی ہے ۔ یہ ایک سطر کی بھی ہو سکتی ہے اور چار سطروں کی بھی ۔ لیکن اس میں سطور کی روانی اور خصوصیت برقرار رہنی چاہیئے ۔ اسے ایک جملہ یا ایک پیراگراف میں استعمال کر سکتے ہیں ۔ یا پھر

(الف) اقتباسات کے دوسرے نشانات ابتدا اور انتہا میں

لگائے جائیں۔ یا

(ب) یا پھر کاغذ میں اتنی ہی جگہ حوالے کے لیے چھوڑ دیں۔

اقتباسات کی دوسری شکل قدرے طویل ہوتی ہے۔ اس میں پانچ سے زیادہ سطریں ہوتی ہیں۔ یہاں اقتباسات کے نشانات نہ ابتدا میں ہوں اور نہ انتہا میں۔ بلکہ سطروں کے درمیان SINGLE LINE SPACING ہونی چاہیے۔ حوالوں کا اچھی طرح ذکر یا تعارف ہونا چاہیے۔

اگر کسی حوالہ پر کوئی رائے دینی مقصود ہو تو الحاق کی اجازت ہے۔ اگر فٹ نوٹس میں اقتباس آجائے تو ہمیشہ اقتباسات کے دوہرے نشان لگانے چاہئیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر خاصی طویل عبارت نقل کرنی ہو اور بغیر اس کے اسکالر اپنی باتیں نہیں کہہ سکتا تو اسے بحالتِ مجبوری مصنف اور کتاب کے نام کے ساتھ اُس صفحہ کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔

باب ششم

اعداد و شمار کی پروسسنگ

کوڈنگ کوڈنگ کو اُردو میں اشاروں کا کلام بھی کہہ سکتے ہیں۔ یا خفیہ لغت بھی۔ اس کے استعمال سے دانش گاہوں کا معمولی کارکن بھی واقف ہے۔ ریسرچ میں بھی اس کی بنیادی نوعیت وہی ہوتی ہے۔ مگر تھوڑی تبدیلی کے ساتھ، یہ علامتوں کو تفویض کرتا ہے یعنی اعداد و شمار کے ذریعہ جوابات کا تعین کر دیتا ہے۔ ریسرچ میں اسے تقسیم کرنے کا عمل کہتے ہیں۔ جس کی ضرورت ترتیب جدول میں ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ خام مواد کو علامتوں میں بدل دیا جاتا ہے۔ جس کو ترتیب وار بنا دیا جاتا ہے اور اس کی گنتی ممکن ہو جاتی ہے۔ یہ عمل خود بخود نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار مدوِن کرنے والے کے فیصلہ پر ہوتا ہے اور کوڈر، ایک نام ہے اُس شخص کے لیے جس کو اس کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے کہ وہ خام مواد کو مخصوص علامتوں کے ذریعہ الگ کرے۔ تاکہ اُن کی شناخت ہوسکے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ کسی شئے کے لیے کون سا کوڈ استعمال کیا جائے۔ یہ کوڈر پر منحصر نہیں ہوتا ہے۔

کوڈنگ ریسرچ کے مطالعہ کی تین منزلوں پر ہوتی ہے اور تینوں منزلوں میں

تین مختلف افراد اس کام کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں۔ ریسرچ میں جواب دینے والے اشخاص کو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے بیانات اور تاثرات کے لیے ایک سمبل دے دیں۔ یعنی ادب میں اگر اس طرح کا مواد جمع کیا جائے جس میں شاعری کی مختلف اصناف موجود ہوں اور شاعروں کی بڑی تعداد بھی کھڑی ہو اور یہ کہا جائے کہ اصناف کے مطابق آپ اپنی محبوب صنف' یا جس صنف میں آپ شاعری کرتے ہیں اُس کا تحریری اظہار کر دیں یا فلاں خانہ کو بھر دیں یا ایک مخصوص نشان لگا دیں تو اسکالر کو پتہ چل جائے گا کہ آپ غزل کے شاعر ہیں۔ مرثیہ نگار ہیں یا آزاد نظم آپ کی محبوب صنف شاعری ہے۔

دوسری صورت DATA جمع کرنے کے دوران موضوع کے انتخاب کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ یہاں جواب دینے والا اپنی پسند کا موضوع یا عنوان مقرر کر لے سکتا ہے اور اس پر نشان لگا سکتا ہے۔ یہ نشان اُس کے لیے ایک علامت کی حیثیت رکھے گا۔

آخری منزل اُس وقت آتی ہے جب خام مواد جمع ہو جاتا ہے اور وہ پروجکٹ آفس یا اسکالر کے پاس بھیج دیا جاتا ہے اور ——— اسکالر خود اپنی سمجھ داری اور فیصلہ کے مطابق کوئی سمبل متعلقہ افراد کو دے دیتا ہے۔

انٹرویو لینے والا یا ملاقاتی مشاہدات اور رویوں پر نظر رکھتا ہے۔ دونوں حالات اور فرد کے ذاتی رویوں کا براہ راست مطالعہ کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے پاس فیصلہ صادر کرنے کے حقیقی جواز حاصل ہو جاتے ہیں بہ نسبت اور لوگوں کے جنھیں اس طرح کوئی کوڈنگ نہیں کرنی ہوتی۔

اس میں وقت اور محنت کی بہت بچت ہوتی ہے۔ جو کوڈنگ آفس میں کی جاتی ہے اُس میں خاصا وقت لگتا ہے۔ یہ کام صلاح و مشورہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ اُن کا فیصلہ جائے وقوع پر کیے جانے والے کوڈنگ سے زیادہ بہتر ہو۔ مگر کوڈنگ کے سلسلہ میں چند پریشانیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان سے غافل نہیں رہنا چاہیے ورنہ ہوسکتا ہے کہ نامکمل اور غلط DATA کے ذخیرہ کی وجہ سے کوڈنگ سے مثبت نتائج نہ نکلے۔ اس کی وجہ DATA صحیح کرنے کے اصولوں کو نظرانداز کرنا ہے۔ DATA کی چھان بین اس لیے کی جاتی ہے کہ اس کا معیار اعلیٰ ہو اور غیر معیاری حصہ حذف کر دیا جائے۔ اس طریقۂ کار کو EDITING یا تدوین کہتے ہیں۔ ریسرچ میں تدوین کی بڑی بنیادی اہمیت ہے۔ خصوصیت سے ادب میں جب دیوان کی تدوین ہوتی ہے۔ یا شعرا کے کلام کی تدوین کا مسئلہ درپیش ہوجاتا ہے تو کوڈنگ کی طرف نظر کرنی پڑتی ہے۔ تدوین کے ذریعہ اُن غلطیوں کی بھی نشان دہی ہوجاتی ہے جو اسکالر، انٹرویو لینے والے اور سوال نامہ مرتب کرنے والوں سے تحقیق کے اصولوں کو برتنے اور DATA جمع کرنے میں غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

تدوین[1] EDITING

تدوین کا کام بڑے جان جوکھم کا ہے۔ اس کے لیے بڑے صبر، ریاضت وسیع مطالعہ اور خضوع و خشوع کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اس میں DATA خصوصیت سے انٹرویو، رویوں اور سوال نامہ کے ذریعہ حاصل کیے گئے مواد کا مطالعہ خاص تنقیدی نگاہ سے کیا جاتا ہے۔ اس لیے جو لوگ تدوین کے کاموں میں دل چسپی رکھتے ہیں انھیں دیکھنا چاہیے کہ دریافت طلب باتیں وضاحت کے ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔ انھیں اس پر نگاہ رکھنی ہوگی کہ انٹرویو، یا رویوں کے سلسلہ میں خام مواد کی جس طرح کوڈنگ کی گئی ہے وہ قابلِ فہم ہے یا نہیں۔ اس لیے مواد کا اپنی مکمل شکل میں موجود رہنا بے حد ضروری ہے

تدوین تحقیق کے طریقۂ کار کا ایک اہم جزو ہے۔ خصوصًا ادب اور اُردو کے صاحب دیوان شاعروں کے کلام کی تدوین کا مسئلہ کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ کہنا کہ :-

"تدوین دراصل تحقیق سے آگے کی منزل ہے، درست نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تحقیق کے پورے نظام کو سمجھنے اور اُس کی بنیاد پر اپنے تحقیقی نظام کا خاکہ تیار کرنا ہر کس و ناکس کے

---

[1] اس مسئلہ پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے ایک اہم کتاب بہ عنوان "اصول تحقیق و ترتیب متن" لکھی ہے۔ جس کا مطالعہ ریسرچ سے دل چسپی رکھنے والے اساتذہ کرام اور اسکالر کے لیے لازمی ہے۔

بس کی بات نہیں اس کے لیے مختلف علوم کی واقفیت اور اُن میں
مہارت شرط ہے۔ خصوصاً علم لسانیات، قواعد و زبان و بیان
اور عروض کی پیچیدگی پر گہری نظر ضروری ہے۔ فارسی اور
عربی زبان و ادب کا علم بھی تدوین کے سلسلہ میں شرط ہے کیونکہ
اُردو شاعری کا سارا کلاسیکی سرمایہ عربی و فارسی کے زیر اثر
تخلیق کیا گیا ہے۔

اس حقیقت کے باوجود یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کہ تدوین
تحقیق سے الگ کوئی شئے ہے یا اس سے زیادہ ارتقائی ذہن کا
عمل ہے۔ بذات خود تحقیق کی ساری دنیا ہی موجودہ دور میں
سائنسی بن گئی ہے اور سائنس میں ہر شئے کی ماہیت اپنی جگہ علحدہ
وجود نہیں رکھتی۔ تحقیق دور حاضر میں صرف تدوین و ترتیب
متن کا نام نہیں۔ بدقسمتی سے اُردو کے چند محققوں نے اس کے
دائرۂ عمل کو محدود کر دیا ہے اور اس کی سب سے بدترین مثالیں
دانش گاہوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جہاں تنقیدی شعور کے
فقدان کے ساتھ ساتھ تحقیق کے اصولوں سے ناآشنائی کے
دل چسپ نمونے موجود ہیں۔[۱]"

یہ کہنا بھی کہ:-[۲]

"تحقیق و تدوین کے سلسلہ میں مالی منفعت کا جذبہ
نہ ہو۔"

۱۔ ادبی تحقیق: رشید حسن خاں ص ۶۱ ۲۔ ایضاً ص ۶۸

درست نہیں۔ میں تو اس کے برعکس یہ تصور پیش کرنے کی جرأت رکھتا ہوں کہ اگر مالی منفعت کا جذبہ پیش نظر ہے تو آج اس کے لیے فضا بے حد سازگار ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اعلیٰ ترین علمی اور عقلی ذہن موجود ہو۔ سینکڑوں مسودہ کرم خوردہ ہو چکے ہیں۔ سینکڑوں الماریوں میں بند ہیں۔ اگر ان کی چھان بین کی جائے، ایک وسیع پروجکٹس کی شکل دی جائے اور تحقیقی نظام کو پھیلا دیا جائے تو رقم بھی حاصل ہو سکتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اُسے نظرانداز کر دیا جائے۔ لیکن اس عمل کے لیے بے شک اُن شرائط کی ضرورت ہے جن کا گزشتہ ابواب میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ تحقیق کے لیے سائنسی نقطۂ نظر اپنانے اور اُسے برتنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں تحقیق اور تدوین کو دو مختلف موضوع نہیں تسلیم کرتا۔ بلکہ تحقیق کا ایک اہم ترین جزو سمجھتا ہوں۔ اُردو ادب میں تحقیق کی یہ صورت خاصی مقبول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو والوں کا مزاج علمی ہوتے ہوئے بھی تن آسانی چاہتا ہے۔ انھیں اس میں دل چسپی نہیں کہ تدوین کی جدید ترین تکنیک سے فائدہ اُٹھایا جائے اور مغربی ادبیات میں اس سلسلہ میں جو کام ہوتے ہیں اُن پر نظر رکھی جائے۔ ویسے ہمارے بڑے محققوں نے اس سلسلہ میں بڑے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، علی سردار جعفری، محمد حسن، تنویر علوی اس کی بے حد اچھی مثالیں ہیں۔ ان حضرات کے کارنامے نہ صرف اہم ہیں بلکہ سائنسی تحقیق کے عمدہ نمونے ہیں۔

فٹ نوٹس

فٹ نوٹس رسمی تصدیق نامہ ہے۔ جس کی ضرورت اُس وقت ہوتی ہے جب اسکالر مقالہ لکھتے وقت کسی خیال، عبارت، کتاب اور مصنف سے استفادہ حاصل کرتا ہے اور اُسے اس بات کی اشد ضرورت ہو جاتی ہے کہ وہ ان کا نام اور تذکرہ اپنے مقالہ میں کرے۔ یا وہ سند کے طور پر انھیں پیش کرے۔ یہ ہمیشہ صفحہ کی نچلی اور آخری صفحوں پر دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی بعض مقالوں کے مختلف ابواب کے آخر میں لکھا جاتا ہے۔ لیکن اس سے پڑھنے والوں کو دشواری ہوتی ہے۔ چونکہ باب کے آخر میں فٹ نوٹس کی تعداد بڑھ جائے گی اس لیے بہتر صورت یہ ہے کہ اسے ہر صفحہ کے آخر میں رکھا جائے۔ اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ فٹ نوٹس کی بہتات قاری کے لیے پریشانی کا سبب بن جاتی ہے۔ اُس کا دھیان ایک جگہ نہیں رہ پاتا اور وہ صفحات اُلٹنا شروع کر دیتا ہے۔ اس لیے اسکالر کو مقالہ لکھتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اس کا برمحل استعمال ہو۔ ورنہ یہ مقالہ کی تکنیکی اعتبار سے خامی تصور کی جائے گی اور وہی فٹ نوٹس عام طور سے مقالہ کا جزو لاینفک خیال کیا جاتا ہے۔ اور اسی لیے اقتباسات کی طرح اس کی بھی بھرمار ہوتی ہے۔ جب مقالہ کا مواد جمع ہو جائے اور اسکالر تحریر کا آغاز کرنا چاہے تو اس وقت اُسے اپنے نگراں سے رجوع ہونا چاہیے اور اہم مقام اور نکات کی طرف دھیان دینا ضروری ہے۔ وہ تمام اہم ابواب اس کی نگاہوں کے سامنے ہونے چاہئیں جن کے بغیر مقالہ تشنہ رہ جائے گا اور ان ابواب میں فٹ نوٹس کی ضرورت کی نشان دہی پہلے کرنی چاہیے تاکہ ان کے غیر ضروری استعمال سے بچا جا سکے۔

فٹ نوٹس حسب ذیل جگہوں میں دیا جانا چاہیے :۔

(۱) کسی خاص نکتہ، بیان اور دلائل کی تصدیق کے لیے، اس کے ذریعہ بنیادی ذرایع کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ یہ اسکالر کی ایمان داری اور ذمہ داری کے لیے ضروری ہے کہ وہ مختلف مصنفین کی فہم و فراست کا اعتراف کرے اور فٹ نوٹس اس اعتراف کی عملی شکل ہے۔

(۲) مواد کی تشریح، اضافہ اور تصدیق کے لیے اس کی شمولیت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سی غیر ضروری باتوں کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

(۳) دوسرے ابواب اور کتابوں کے لیے یہ CROSS REFERENCE بن جاتا ہے۔

(۴) کسی براہ راست یا بالواسطہ اقتباس کے اعتراف کے وقت بھی اس کی حاجت رہتی ہے۔

(۵) قاری کو فٹ نوٹس سے بہت مدد ملتی ہے۔ وہ ان کے ذریعہ بہت سی کتابوں، رسالوں، جرائد، اخبارات کی ورق گردانی کرتا ہے اور ان کے مطالعہ کے ذریعہ وہ اپنی تحقیقی دشواریوں پر قابو پا لیتا ہے۔ اور اسے نگراں کی قدم قدم پر ضرورت نہیں رہتی۔

فٹ نوٹس میں اس طرح کی اطلاعات شامل رہتی ہیں :-

(۱) اطلاعات کے سرچشمہ، خاص کر مصنفین کے اسمائے گرامی

(۲) ذرائع کے عنوانات

(۳) کسی REFERENCE کا مخصوص صفحہ

(۴) مطبوعات کی تاریخ اشاعت

(۵) ناشر کا نام اور مقام اشاعت

جب اتنی باتیں ذہن میں صاف ہو جائیں تو فٹ نوٹس کو کس جگہ رکھا جائے یہ سوچنا چاہیے۔ عام طور پر صفحہ کے آخر میں جیسا کے نام سے ظاہر ہے۔

(۱) یا پھر باب کے آخر میں یا

(۲) مقالہ کے آخری حصّہ میں

فٹ نوٹس کے حوالے جہاں کہیں بھی رکھے جائیں وہ SUPER SCRIPTS استعمال سے واضح ہوتے ہیں۔ عام طور پر اگر SUPER SCRIPTS جملوں کے آخر میں نشان دہی کے لیے لکھے جائیں تو پڑھنے کے دوران قاری کو کم رکاوٹ محسوس ہوگی۔ لیکن اس اصول پر سختی سے کاربند رہنا مشکل ہو تو ابتدا میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ البتہ اقتباس کے ساتھ فٹ نوٹس ہمیشہ آخر میں ہوتا ہے۔ ہمیشہ بغیر کسی اعراف اور اوقاف، یا بغیر کسی خالی جگہ کے نظر آتا ہے۔ جب کبھی فٹ نوٹس صفحہ کے آخر میں رہتا ہے تو وہ متن سے الگ تقریباً ۱½ انچ کے فاصلہ سے بائیں طرف چھوڑ کر آتا ہے اور جب فٹ نوٹس ابواب کے آخر یا مقالہ کے اختتام پر لکھا جائے تو فٹ نوٹس کا بڑا عنوان لکھ دیا جاتا ہے۔

عام طور سے فٹ نوٹس کی پہلی لائن پیراگراف کی شکل میں لکھی جاتی ہے لیکن اگر یہ ایک سطر سے زیادہ ہو تو دوسری لائن کی جگہ اختیار کرتی ہوگی۔ فٹ نوٹس بالترتیب نمبروار لکھا جاتا ہے۔ اگر کسی مقالہ میں اس کی تعداد بہت کم ہے تو ہر صفحہ میں اس کا نشان لگایا جا سکتا ہے۔

فٹ نوٹس کے استعمال کے سلسلے میں مختلف قسم کا رواج عام ہے:—

(۱) فٹ نوٹ میں جب کہ پہلی بار بنیادی اور ثانوی ذرائع کا استعمال

کیا جا رہا ہے تو مصنف کا پورا نام ترتیب کے ساتھ لکھا جانا ضروری ہے۔

(۲) حوالہ جات کی تفصیلات بیان کرنے کے لیے کتابیات کے اصول و ضابطے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ تخلیقات کے عنوانات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ مضمون کے عنوان کے اوپر واوین لگایا جاتا ہے۔

(۳) پہلی بار جب حوالہ استعمال کر لیا گیا ہو تو یہ ضروری نہیں کہ فٹ نوٹس میں اُسے مکرر دہرایا جائے۔

ایجاز و اختصار کے مسلمہ اصول بن چکے ہیں۔ اُن سے استفادہ حاصل کرنا چاہیے تاکہ ایک ہی نام بار بار نہ لکھا جا سکے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ فٹ نوٹس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں پائی جاتی۔ کئی مقام آتے ہیں جب دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر فٹ نوٹس کئی صفحات پر مشتمل ہے تو یہ جملے کے وسط تک برقرار رہتا ہے تاکہ دوسرے صفحہ کے آخر میں وہ پھر سے نمودار ہو سکے۔

ثانوی ذرائع کو تحریر کرتے وقت سنگل فٹ نوٹس کافی ہوتا ہے۔

فٹ نوٹس استعمال کرتے وقت یہ بات ضرور ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ اس کی شمولیت مقالہ کو وقیع بناتی ہے اور استدلال میں مدد دیتی ہے۔ لہٰذا مقالہ کی پہلی کاپی میں ہی اس کو لکھ لینا چاہیے۔ تاکہ نظرِ ثانی کے وقت کوئی مشکل نہ ہو۔ پھر جب آخری منزل آجائے تو ہر فٹ نوٹس کی اچھی طرح جانچ کر لینی چاہیے۔ اور یہ دیکھنا چاہیے کہ کہیں کوئی بھول چوک نہ ہو اور صفحات کے حوالہ بھی درست ہوں۔ پھر ایک بار اسی

طریقۂ کار کو چن لینے کے بعد اس کو برابر پیش نظر رکھنا چاہیے۔ تاکہ پورے مقالہ میں ایک طرح کی ہم آہنگی موجود رہے۔ فٹ نوٹس مختصر ہوں۔ لیکن اختصار کا یہ مطلب نہیں کہ تحریر کی صفائی اور روانی کو نظر انداز کر دیا جائے۔

تمام فٹ نوٹس لفظوں یا ٹائپ کے حروف کے درمیانی فاصلہ میں ہوں۔

تمام فٹ نوٹس طوالت کے باوجود فقرے مکمل کرنے کے بعد ہی ختم ہوتے ہوں۔

مقالہ کے تمام اوراق کے آخری صفحہ میں تھوڑی سی جگہ خالی ہونی چاہیے۔

اس طرح تحقیق کا ایک اہم عنصر فٹ نوٹس بھی ہے۔ اُردو کے اسکالر اس کا استعمال ضرور کرتے ہیں۔ نگراں بھی اس کی اہمیت سے واقف ہیں۔ لیکن اس کے برمحل استعمال کی طرف اُن کی توجہ نہیں ہوتی۔ اس تکنیکی خامی سے تحقیق کا معیار مشکوک ہو جاتا ہے

ضمیمہ یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ تھیس یا تحقیقی مقالوں کے قارئین اعلیٰ ذہنی سطح کے ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان کی حیثیت یونی ورسٹی کے دانش وروں کی ہوتی ہے۔ یا اُن کے اسکالروں کی، یا تحقیق و تنقید سے وابستہ ادیبوں، محققوں اور اہل قلم حضرات کی۔ اس لیے مقالہ میں جو بھی لکھا جائے اُس کی سطح معیاری اور معلوماتی ہونی چاہیے۔

کسی تسلیم شدہ حقیقت، واقعہ، نظریہ سے انحراف کرتے وقت اس امر کا ہمیشہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ دلیلیں عقلی اعتبار سے افضل ہوں، حوالہ مستند ہوں اور علمی لحاظ سے انھیں تسلیم کرلیا جائے۔ اس پر عمل کرنا اُسی وقت ممکن ہے جب اسکالر کی اپنی ذہنی استعداد اچھی ہو، اُس کے نگراں کو علم وادب سے شوق ہو، اُن میں تجسس کا مادہ ہو اور رہنمائی کے فن سے واقف ہوں۔ جب تک یہ خصوصیات نگراں اور اسکالر میں نہ ہوں گی وہ مقالوں کے معیار کو عام سطح سے بلند نہیں کر پائیں گے۔

تحقیقی مقالہ میں کبھی کبھی اہم اور ضروری باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ مقالہ رکھ لینے کے بعد اُن کی شمولیت مقالہ کو گنجلک اور ناہموار بنا دے گی۔ اس لیے ایسے موقع پر ان اہم اور معنی خیز حصہ کو ضمیمہ میں جگہ دیتے ہیں۔ اس سے نہ پورے مقالہ کی صحت پر اثر پڑتا ہے اور نہ کسی طرح کی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ ذہین اور تیز قاری مقالہ کے اس حصہ کو بھی اُسی شوق سے پڑھے گا جس طرح وہ پورے مقالہ کو پڑھتا ہے۔ اس لیے ضمیمہ کا حوالہ مقالہ میں ہونا چاہیے۔ یا پھر مقالہ کے مناسب حصہ میں فٹ نوٹ کے ذریعہ بھی ضمیمہ کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ مناسب حصہ وہی ہوگا جہاں سے ضمیمہ کی باتیں مقالہ میں بیان کی جاسکتی ہیں۔ یہ اشارہ بڑی تحریروں کے ذریعہ کر دیا جاتا ہے تاکہ قاری آسانی سے سمجھ لے۔

اسی طرح کے دوسرے اشارے بھی بعد میں کیے جاسکتے ہیں۔ ضروری حصہ کو ضمیمہ میں شامل کیا جائے یا نہیں، یہ اسکالر کی قوتِ فکر اور فیصلہ کی طاقت کے ساتھ ساتھ اُس کے ذہن کی صفائی پر ہی منحصر ہے۔ اگر اس کا ذہن کسی بات، کسی مواد کے سلسلہ میں بالکل صاف ہے اور وہ کسی مغالطہ کا شکار نہیں تو وہ

آسانی سے طے کرلے گا کہ اسے ضمیمہ میں شامل کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔
اہم ترین مواد، جیسے طویل ترین اقتباسات، ڈائری کے بیانات، کیس اسٹڈی
کی تفصیلات کو بہ آسانی ضمیمہ کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سوال نامہ
اور ڈاٹا حاصل کرنے کے دوسرے ضروری کاغذات کو بھی ضمیمہ میں رکھ سکتے ہیں
البتہ ان کے ساتھ تحریری نوٹس دینا بہتر ہوتا ہے۔ اعداد و شمار، ان کے ٹیبل،
یا خام مواد کو ضمیمہ میں رکھنا ہی سود مند ہے۔

تھیسس کے کسی حصہ کا کوئی اہم مواد اگر چھوٹ گیا ہے اور پوری تھیسس
کو وہ متاثر نہیں کرتا لیکن مخصوص باب کے لیے ضروری ہے تو اُسے بھی ضمیمہ کا ہی
حصہ سمجھنا ہوگا۔ تکنیکی نوٹس جو تجزیاتی طریقوں سے حاصل کیے گئے ہیں اپنے
خاکوں، تصویروں کے ساتھ ضمیمہ کا جزو بن جاتے ہیں۔ عام طور پر ضمیمہ
اس طرح لکھا جانا چاہیے۔

ضمیمہ ۱

یہ صفحہ کے مرکزی حصہ پر لکھا ہوتا ہے۔ پھر تھوڑی جگہ چھوڑ کر عنوانات
لکھے جانے چاہئیں۔
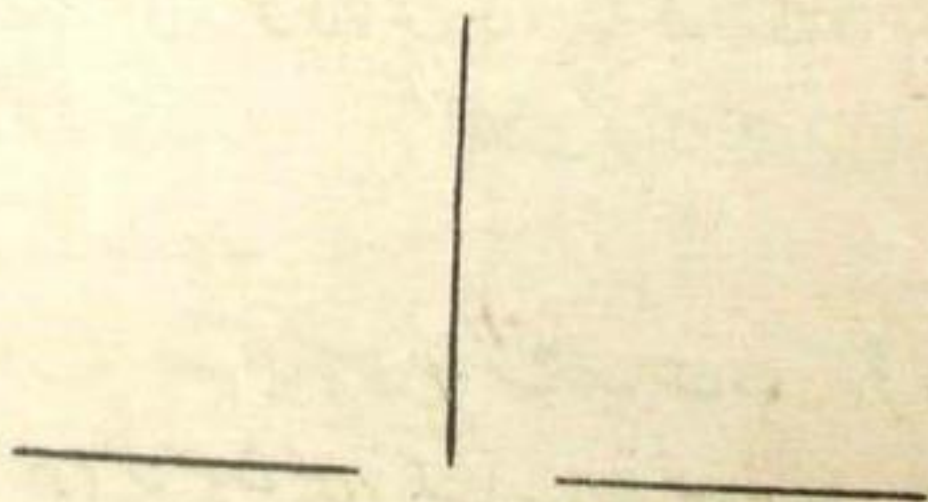
ضمیمہ ۲

ضمیمہ کئی ہوں تو اسی مناسبت سے اُن کی نمبرنگ ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب

الگ الگ صفحوں پر ہوتا ہے۔

ضمیمہ اردو میں عام طور سے آخر میں شامل کیا جاتا ہے۔ لیکن اسے مقالہ اور کتابیات کے درمیانی حصہ میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ یا کتابیات کے فوراً بعد کے صفحہ پر بھی تحریر کیا جا سکتا ہے۔ اس کی شمولیت کے متعلق کوئی خاص اصول وضع نہیں کیے گئے ہیں، بس جو رسم چل نکلی ہے، سبھی اُسی کی پیروی کرتے ہیں۔

حوالوں کا نظام

حوالوں کی مقالہ میں بڑی اہمیت ہے۔ اس کے بغیر نہ مطالعہ کا احساس ہوتا ہے اور نہ دلیلوں کے لیے سند مہیا کی جا سکتی ہے۔ نتیجہ اخذ کرنے کی راہ میں بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ مقالہ کا ایک بڑا غیر معمولی عنصر ہے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ اسکالر کو اس کی پوری آگاہی ہو۔ مختلف اہل قلم نے اسی حقیقت کے پیش نظر اسے ایک ایسے نظام سے تعبیر کیا ہے جس کے بغیر تھیس کی عمارت مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس کی پائداری، بقا اور دلکشی کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ حوالوں کے نظام پر بڑی سخت گرفت ہو اور اسے اچھی طرح مقالہ میں جگہ دی جائے۔

حوالوں کے سلسلہ میں پہلی چیز کتابیات ہے۔ اگر آپ کتابیات کو ذرا وسیع مفہوم میں سمیٹ لیں تو کتابیات میں غیر شائع شدہ کتابیں اور مسودہ بھی آجاتے ہیں۔ ویسے تکنیکی اعتبار سے کتابیات کی فہرست میں صرف شایع شدہ کتابیں ہی شامل کی جاتی ہیں۔

کتابیات کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں :-

(۱) وہ کتابیں جن کا ذکر مقالہ میں کیا گیا ہے اور جو مختلف ذرائع سے تعلق رکھتی ہیں - یا یہ فٹ نوٹس میں شامل ہیں یا مقالہ میں، ان کے حوالے موجود ہیں -

(۲) مواد کی فراہمی کے ذرائع بذاتِ خود اپنی جگہ ایک وسیع ذخیرہ کتابیات ہیں - ان کے ذریعہ کتابوں، مضامین، اخبارات کا بہت بڑا سرمایہ مل جاتا ہے - ان میں وہ مواد بھی شامل ہے جن کا براہِ راست تعلق موضوع سے ہے اور وہ بھی جو براہ راست تعلق نہیں رکھتے -

(۳) تیسری قسم منتخب کتابیات کی ہے - لیکن اس میں موضوع سے متعلق زیادہ اہم مواد جمع رہتا ہے -

(۴) یہ ایسی کتابیات ہیں جسے ہم تشریحی کہہ سکتے ہیں - اس میں حوالہ جات کی فہرست ہوتی ہے - اس لیے اسے وضاحتی ببلیوگرافی بھی کہتے ہیں - اس میں اس کی افادیت اور اہمیت کا ذکر ہوتا ہے -

کتابیات کی پہلی قسم بہت عام ہے - ریسرچ میں تمام لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں - کتابیات کی فہرست عام طور سے تھیسس کے فوراً بعد کے صفحات میں لکھی ہوتی ہے - ویسے کچھ لوگوں نے اسے ضمیمہ کے بعد رکھنے کی سفارش کی ہے -

ہر وہ کتاب، مضمون، اخبار، رسالہ، دستاویز، مسودہ، مقالہ جو ریسرچ کے دوران اسکالر کے زیر مطالعہ رہا ہے اور اُس پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے، اس پہلی قسم میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ فہرست حروف تہجی کے مطابق تیار کی جاتی ہے۔ ویسے ان دنوں کتابیات کی مجموعی فہرست کا رواج بھی عام سا ہو گیا ہے اور بنیادی اور ثانوی ذرائع کے خانوں میں اس فہرست کی کتابوں کو نہیں رکھا جاتا۔ لیکن تاریخی تحقیق کے لیے حروف تہجی اور بنیادی اور ثانوی خانوں پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے ———

حوالہ جات کے لیے کوئی مخصوص قاعدہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ آپ نے فٹ نوٹس کا استعمال کہاں اور کیسے کیا ہے۔ اسکالر مقالہ کی نوعیت اور اپنی سہولت کے پیش نظر انھیں رکھ سکتا ہے۔ ان تمام باتوں کے پیچھے مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مقالہ میں تسلسل اور ہم آہنگی کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور روانی برقرار رہے۔

حوالہ کے سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مصنف کا نام، کتاب کا عنوان، تاریخ اشاعت، ناشر کا نام، مقام اشاعت' ان سب کی صحیح معلومات ہونی چاہئے اور تب انھیں درج کرنا چاہئے۔ کیونکہ ایک تحقیقی مقالہ کی بنیاد پر آنے والے کئی مقالہ لکھے جاتے ہیں، اور اگر ایک جگہ غلط نام، غلط تاریخ لکھ دی گئی تو یہ غلطی بعض اوقات برسوں منتقل ہوتی چلی آتی ہے اور غلط بنیاد پر لوگ مفروضات کی عمارت تعمیر کر لیتے ہیں۔ اس لیے بیداری اور تصحیح کے ساتھ ساتھ تصدیق نامہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ عام طور پر مشہور رسالے، اخبارات جیسے

نگار، شاہراہ یا پھر شب خوں، آج کل، نقوش، سویرا، ادب لطیف، اوراق کے متعلق لوگوں کو علم ہے لیکن جو کتابیں کئی جلدوں میں ہیں اگر اُن کی صحیح تفصیلات نہیں لکھی گئیں تو بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ اور اسکالر کی خامی تصور کی جاتی ہے۔

گذشتہ صفحات میں یہ لکھا گیا ہے کہ کتابیات حروف تہجّی کے مطابق تیار کرنی چاہیئے۔ لیکن کبھی کبھی اس پر سختی سے پابند رہنا ایک مسئلہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے اسکالر کو پیدا شدہ مسئلہ سامنے رکھ کر اُسے حل کرنا چاہیئے اور اگر حروف تہجی پر عمل پیرا ہونا مشکل ہے تو اُسے انحراف کی اجازت ہے۔ مثال کے لیے اگر کوئی مرتب شدہ کتاب سامنے آگئی ہے اور اس کے مرتبین کئی ہیں تو حروف تہجی سے کام نہیں چلے گا۔ ایسی صورت میں پہلا طریقہ یہ ہوگا کہ کتاب اور مرتبین دونوں کو شامل کر لینا چاہیئے۔ ساتھ ہی کتاب کا عنوان بھی لکھ دینا ضروری ہے۔ پھر مرتبین اور کتاب کی تفصیلات کا اندراج کر لیا جائے۔ یا پھر دونوں کے لیے الگ الگ اندراج عمل میں لایا جائے۔ اور تب انھیں حروف تہجی کے مطابق لکھا جائے۔ یہ دوسرا طریقہ میں زیادہ بہتر عملی اور کارآمد ہے۔

بعض مضامین، کتابیں یا مواد (شایع شدہ) ایسے ہوتے ہیں، جن کے مصنف یا مرتبین کے متعلق کوئی کچھ نہیں جانتا۔ ان کا نام بھی کہیں لکھا ہوا نہیں ہوتا۔ ایسی کتابوں کو فرضی خانوں میں رکھنا چاہیئے۔ اور اُن تخلیقات کو عنوانات کے تحت فرضی خانوں میں لکھا جانا چاہیئے۔ اس طرح اُردو میں بہت سے مضمون اور بہت سی کتابیں اور بھی ہیں جن کے مصنف کوئی نہیں جانتا۔ مسودہ تو بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ لہٰذا ان کی

کتابیات تیار کرتے وقت سطور بالا کی ہدایتوں پر عمل کرنا چاہئے۔

اشاریہ ریسرچ کا آخری باب اشاریہ کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ تحقیق کی ایک اہم منزل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نہ تحقیس مکمل ہوتی ہے اور نہ اُس کا کوئی معیار نظر آتا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دورانِ ریسرچ جتنی کتابیں نظر آئیں سب کو اشاریہ میں شامل کرلیا جائے۔ لیکن یہیں تک اُس کی دنیا محدود نہیں ہے۔ یہ فہرست نہیں ہوتی ایک چھوٹا موٹا تکنیکی کام ہوتا ہے۔ ہر اہم اور قاعدہ کی کتاب میں اس کی جگہ مصنف محفوظ رکھتا ہے۔ ہر ایماندار فن کار اپنی تخلیق کے آخری حصّہ میں اس کی شمولیت کی طرف خاصا زور دیتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں غیر تحقیقی کتابوں ہی اس کی طرف بہت کم دھیان دیا جاتا ہے۔

تحقیقی مقالہ کا ایک اہم جز و اشاریہ ہوتا ہے۔ اُردو میں اس کا رواج بہت کم ہے۔ مگر اس کا کبھی یہ مطلب نہیں کہ اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ ہماری تن آسانی اور سہل نگاری ہے، جو اشاریہ کو مقالوں کے آخر میں بھی شامل نہیں کرتے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم بہ آسانی دورانِ مطالعہ ضرورت پڑنے پر مصنف، شہر، کتابوں کے نام اور حوالہ کو فوراً دیکھ لے سکتے ہیں۔ اس کی وجہ سے حوالوں کے نظام کی ترتیب میں بھی مدد ملتی ہے۔

اشاریہ کئی طرح سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ مصنفوں کے نام سے بھی

اس کی ابتدا ہو سکتی ہے۔ اور کتابوں کے ذکر سے بھی اس کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ تر اہل قلم حضرات کے اسمائے گرامی اشاریہ میں ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے صفحہ اور اس کی تعداد کے ساتھ ہی اُن کے نام لکھے جاتے ہیں تاکہ ان حوالہ کے وقت انھیں دیکھا جا سکے۔ اسے ہم AUTHOR INDEX کہتے ہیں۔ ناموں کو انگریزی میں جس طرح لکھا جاتا ہے ویسے ہی اُردو میں بھی لکھنا بہتر ہے۔ یعنی اگر مصنف کا نام ہے

R. L. ACKROFF تو

ACKROFF - R. L. لکھا جائے گا۔ اب یہ نام جتنے صفحات میں لکھے گئے ہیں ان تمام کے صفحات نمبر نام کے نیچے لکھ دینا ضروری ہے۔ اگر کسی کتاب میں مصنفین کے نام سَو ہیں اور ان سَو مصنفین کا ذکر دس دس بار ہوا ہے تو قاعدہ کے مطابق دس صفحات جن کا نمبر مختلف ہو سکتا ہے۔ (اور کوئی ضروری نہیں کہ یہ ذکر ترتیب کے ساتھ ہو) اشاریہ میں لکھنا ضروری ہے۔ مصنفین کے نام کے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ حروف تہجی کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اُردو میں الف سے اس کی ابتدا کرنی چاہیے۔ تحقیقی مقالہ میں اس طرح کی پابندیوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔

بہت سے اسکالر ابواب کے آخر میں اشاریہ لکھ دیتے ہیں۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے یہ طریقۂ کار کے خلاف ہے۔ تحقیق صرف معلومات کی کھتونی نہیں ہوتی بلکہ وہ فکر و ذہن کی تنظیم کا بھی پتہ دیتی ہے۔ اس لیے جس شے کی جگہ ماہرین نے جہاں مقرر کر دی ہے وہی رکھنی چاہیے۔

مصنفین کے ذکر کے بعد اشاریہ شہروں اور کتابوں کی مدد سے بھی

تیار کیا جاتا ہے۔ اگر آپ 'اردو ناول میں شہر' کے عنوان پر تحقیق کر رہے ہیں تو اس میں بہت ممکن ہے کہ ہندوستان کے پچاسوں شہر کا ذکر ہو۔ اب یہ ذکر پُر معنی ہوگا۔ محض نام نہیں گنوائے جائیں گے۔ کیوں کہ اسکالر طالب علم کی طرح، ہندوستان کے بڑے اور چھوٹے شہروں کے نام یاد نہیں کر رہا ہے بلکہ اسکالر اردو ناولوں میں شہروں کی زندگی، اس کے نگارخانوں، اُس کے مسائل اور پیچیدگیوں کا ذکر کرے گا، وہاں کی مشینی زندگی پر روشنی ڈالے گا، وہاں کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کا نقشہ کھینچے گا۔ اس لیے اس طرح کی تحقیق میں شہروں پر اشاریہ مشتمل ہوگا۔ اس کی ترتیب بھی حروف ہجی پر کرنی چاہیے۔ البتہ مصنفین کے اسمائے گرامی کی طرح ترتیب نہیں ہوگی۔

پھر کتابوں کا بھی اشاریہ ممکن ہے۔ کتابوں، رسالوں اور جرائد کا ذکر کتابیات میں ہوتا ہے۔ لیکن بعض اہم کتابیں بارہا تحقیقی مطالعہ کے دوران آتی ہیں۔ اُن میں لکھی گئی باتوں کی تصدیق ہوتی ہے، اُن میں پیش کیے گئے تصورات سے انحراف ہوتا ہے یا اس کی تائید مقصود ہوتی ہے۔ بہرحال متعدد بار ذکر ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو اشاریہ کتابوں کا بھی قائم کر سکتے ہیں۔ اس میں محنت بہت نہیں ہوتی لیکن اردو والوں کے مزاج کے خلاف ہے اس لیے وہ اس کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ اشاریہ تحقیق کی آخری منزل ہوتی ہے اور اس کی ترتیب میں بہت زیادہ فکر و نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ کوئی بھی تحقیق اشاریہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

نقشہ اور تصویریں

ان دونوں کا استعمال مقالہ میں اس لیے ہوتا ہے کہ اطلاعات کی فراہمی ہو، یہ فراہمی مخصوص موضوعات کی تفصیلات سے متعلق ہوتی ہے۔ اسے غیر ضروری طور پر نہیں استعمال کرنا چاہیے۔ ادبیات میں بھی سماجی علوم کی طرح اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

ٹیبل کا لفظ محدود معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر کوئی اطلاع جدول کی صورت میں دی گئی ہو جس میں ہندسے، زائچوں یا تصویروں کی شکل میں ہوں تو اس سے کام لینا چاہیے۔ صرف اطلاعات کو بلاوجہ دہرانے کی خاطر اسے نہیں رکھنا چاہیے۔ جب تک مقالہ میں شامل کیے گئے مواد کی وضاحت اس کا مطالبہ نہیں کرتی اس سے گریز کرنا ہے۔ اسی طرح جہاں اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا وہاں اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اسے نظرانداز کرنے سے بھی مقالہ میں تکنیکی خامی باقی رہ جائے گی۔

ٹیبل اور نقشہ کی شمولیت سے پہلے اس کے بارے میں تعارفی باتیں لکھ دینی ضروری ہیں۔ ورنہ قاری ان کی مدد کے بغیر صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ مقالہ کی ابتدا ہی میں ان کا تعارف کرا دینا بہتر ہوتا ہے۔ پھر ان کا شمار یکے بعد دیگرے ہونا چاہیے۔ ان دونوں کو صفحات پر پیش کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اگر وہ نصف صفحہ سے زیادہ حصہ لے لیتے ہیں تو پھر پورے نئے صفحہ پر ان کی تصویریں دے دینی چاہیے۔ البتہ اُن میں مضمون کی تفصیلات لکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف صفحہ نمبر دے دینا کافی ہوگا۔ اگر نصف صفحہ سے بھی کم ہی پر آ جاتا ہے تو اس کے گرد نفس مضمون بھی شامل کر دے سکتے ہیں۔ مگر بہتر صورت یہی ہوگی کہ تمام

ٹیبل اور فیگرس الگ الگ اوراق پر ثبت ہوں اور ترتیب کے ساتھ ان کی نمبرنگ کر دی جائے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ ٹیبل اور تصویروں کو مقالہ کا ایک جزو نہیں بنایا جائے بلکہ اسے APPENDIX میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن زیادہ تر اہل قلم اسے مقالہ کا ایک اہم جزو سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں اس امر پر منحصر ہیں کہ مقالہ میں مواد کی نوعیت کیسی ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔ اگر ان کے بغیر کام نہیں چل سکتا تو اس کو مقالہ کا لازمی عنصر سمجھنا چاہئے۔ خاص کر اگر سائنس اور سماجی علوم کی تحقیق کی جا رہی ہے تو اس طرح کے ٹیبل اور تصویروں کے بغیر کوئی کام نہیں چلتا۔ لہذا تمام اطلاعات اور نتائج کے لیے اس کو مقالہ میں شامل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر ٹیبل اور ہندسہ کا مواد مقالہ کے بنیادی حصے سے گہری قربت رکھتا ہے تو اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر اس کے بغیر بھی نتائج حاصل کرنا ممکن ہے تو اس کی مناسب جگہ APPENDIX ہے۔

تمام ٹیبلوں کی باضابطہ گنتی ہونی چاہئے تاکہ اُن کی بہ آسانی شناخت ہو سکے۔ عام طور پر اس کے لیے ARABIC NUMERALS استعمال ہوتے ہیں۔ اگر ٹیبل ضمیمہ کا حصہ ہیں تو گنتی کا سلسلہ آخری ٹیبل سے شروع ہوتا ہے۔ لفظ ٹیبل بڑے حرفوں میں اور ان کا نمبر صفحہ کے مرکزی مقام پر لکھا ہوتا ہے۔ ٹیبل کو گننے کے قواعد و ضوابط وہی ہیں جو ہندسہ یا تصویروں کے ہیں۔ سوائے اس لفظ FIGURE کے جو زیادہ خالی جگہ کے درمیان میں لکھا جاتا ہے۔

ہر ٹیبل اور نقشہ کا ایک عنوان ہوتا ہے۔ ایک طرح سے یہ عنوان

مقالہ کا مختصر ترین جز و پیش کر دیتا ہے۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے
کہ یہ کئی سطروں یا اقتباسات کی شکل میں ہوتا ہے۔ اگر عنوان ایک سطر سے
زیادہ ہو تو اسے لکھتے وقت بڑی جگہیں چھوڑ دینی پڑتی ہیں اور INVERTED
PYRAMID کی طرح رکھنا پڑتا ہے۔

ٹیبل اور فیگر کا عنوان تصویروں، ہندسوں اور ٹیبلوں سے گہری
مطابقت رکھنا چاہیے ورنہ یہ بے معنی ہو جائے گا۔ ٹیبل کے مختلف اجزا
حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ٹیبل کا نمبر
(۲) عنوان
(۳) BOX HEADS

عنوان جس سے اوپر کے کالم کی شناخت ہو سکے۔

فٹ نوٹس اکثر و بیشتر سماجی علوم کی تھیسس میں ٹیبل اور تصویروں
اور خاکوں کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد کسی خاص مفہوم کو واضح
کرنا ہوتا ہے:۔

(۱) بعض مقالوں میں بڑے ٹیبلوں اور تصویروں کی ضرورت
ہوتی ہے۔ جہاں یہ مسئلہ درپیش ہو وہاں بغل کے صفحہ پر اس کو
رکھا جاتا ہے۔

(۲) یا پھر اسے فوٹو گرافی کے ذریعہ چھوٹا بنا دیا جاتا ہے۔

(۳) اسے دوسرے صفحہ پر بھی منتقل کر دیا جاتا ہے۔ مگر یہ
سلسلہ دراز ہوتا ہے۔

(۴) یہ بڑے صفحات پر بھی ہوتا ہے اور اسے موڑ کر تھیسس میں

الگ سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

مگر ان تمام باتوں اور تدابیر کو اختیار کرنے کے پہلے اچھی طرح غور کر لینا چاہئے۔ تاکہ عجلت میں مقالہ بدنما نہ معلوم ہو اور جن اغراض و مقاصد کے تحت انھیں شامل کیا جا رہا ہے وہ فوت نہ ہو جائیں۔ کیوں کہ اس بات کا اندیشہ لگا رہے گا کہ قاری کے مطالعہ میں یک سوئی ختم ہو جائے گی اور دورانِ مطالعہ وہ اپنی نشست کی جگہ بدلنے پر مجبور ہو جائے گا۔

عام طور پر ادبیات کے ریسرچ میں گرافس، نقشہ اور ڈائی گرام شامل نہیں کیا جاتا۔ لیکن اگر مقالہ کا موضوع اس کا متقاضی ہے تو اس ٹکنیک کو ضرور اختیار کرنا چاہئے۔ اس سے نہ صرف ظاہری طور پر تھیسس بہتر اور اچھی دکھتی ہے بلکہ اسکالر کا اچھے اور جدید ذہن کا بھی پتہ چلتا ہے۔

جس طرح مقالہ کے تمام صفحات گنے ہوتے ہیں اُسی طرح ٹیبل اور تصویریں بھی ترتیب وار ہوتی ہیں۔ اُن کی بھی سلسلہ وار گنتی ہوتی ہے۔ صفحہ کا نمبر عام طور سے داہنی طرف کونے کے اوپری حصہ پر دیا جاتا ہے۔ تاکہ جلد بازی میں تحریر کے حصے پوشیدہ نہ ہو جائیں۔

ABBREVIATION عام طور سے مقالہ میں استعمال نہیں ہوتا۔ لیکن ٹیبل اور خاکوں میں اس کا رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس طرح ٹیبل اور ہندسوں یا خاکوں کا استعمال اسکالر کو موضوع کی نوعیت کے پیشِ نظر کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ مقالہ سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو اور محض نمایش کی خاطر شامل کر دیا گیا ہو۔ یہ باتیں نگراں کے لیے بھی ضروری ہیں۔ انھیں چاہئے کہ اس کی طرف اپنے اسکالر کی توجہ مبذول کرائیں اور اس کی تکنیک سے پوری واقفیت بہم کریں۔ تاکہ تھیسس روایتی شکل و صورت سے

الگ ہٹ کر جدید سائنسی تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اُردو کے اسکالر اور نگراں کو خصوصیت سے اس امر کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ اُن کی تن آسانی اور سہل نگاری ڈگریاں تو دلوا دیتی ہے لیکن علمی اثاثہ میں کسی اضافہ کا سبب نہیں بنتی۔ یہی نہیں آنے والی نسل انھیں معاف بھی نہیں کرے گی۔

میں نے ابتدائی ابواب میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ زمانہ جدید تقاضوں سے لیس ہے اور انھیں نظر انداز کر کے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ تحقیق ایک مکمل سائنس بنتی جا رہی ہے اور اس مکمل سائنس کو جب ہم ادبیات کے نقد و جائزہ کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اُن تمام ہیئتی عناصر اور فکری اجزا کو بھی قبول کرنا ہمارے لیے ضروری ہو جائے گا۔ اس کے بغیر نہ صرف اعتدال و توازن کی کمی ہو گی بلکہ تحقیق کی اصلی صورت مسخ شدہ دکھائی دے گی۔

باب ہفتم

مقالہ کی تدوین و تنقید اِس سے پہلے کہ مقالہ ٹائپ کیا جائے یا کتابت کی منزلوں سے گزرے، اس کی نظر ثانی بے حد ضروری ہے۔ نظر ثانی کے بعد تدوین کی سخت ترین راہیں آتی ہیں۔ اچھے مقالہ کی یہ پہچان بتائی جاتی ہے کہ اُس کا کوئی حِصّہ غیر ضروری نہ ہو کوئی اقتباس بھرتی کے لیے نہ رکھا گیا ہو۔ اُس میں اہم ترین فٹ نوٹس ہوں، اُس کی کتابیات اعلیٰ اور جدید ترین کتابوں سے بھری ہو۔ یہ اغلاط کا مجموعہ نہ ہو، زبان و بیان کی خامی سے مبرا ہو، واقعات، تخیل کی بلند پروازی کا ثبوت نہ ہوں۔ ذہنی اختراعات سے گریز کیا گیا ہو، سند اور دلائل شک و شبہ سے عاری ہوں۔ جس لفظ پر بھی شبہ ہو اُس کی لُغت سے تصدیق کرلی گئی ہو، اپنے حافظہ پر اعتبار نہ کیا جائے۔ یہ سب مقالہ کی اس کاپی کے لیے ضروری ہیں جسے ٹائپ کے لیے بھیجا جا رہا ہو۔

مقالہ کی نظر ثانی اور تدوین کے سِلسلہ میں یہ بات دلچسپی سے سُنی جانی چاہیے کہ ایک بار AMERICAN EDUCATIONAL RESEARCH ASSOCIATION نے ۱۲۵ مضامین کو اُن کے ماہرین کے پاس بغرضِ تبصرہ بھیجا۔ تاکہ اُن کے معیار کا صحیح مقام طے کیا جاسکے۔ یہ مضامین ۸۲۷ مضامین کے مجموعہ میں سے منتخب کیے گئے تھے۔ اور یہ سب ۴۱ جرنل میں

شائع ہو چکے تھے۔ لیکن اس ملک کے اعلیٰ ترین ماہرین نے اس کی مناسب جانچ کے بعد فیصلہ کیا کہ ان مضامین کے مجموعہ میں صرف ۷ فی صدی ایسے ہیں، جنھیں معیاری کہا جا سکتا ہے اور جن کی اشاعت مناسب ہے اور بقیہ تمام مضامین نظرثانی کے محتاج ہیں۔ ۵۲ فی صدی ناقابل اشاعت ہیں۔ یہ فیصلہ اسکالرس اور اُن کے نگراں دونوں ہی کے لیے شرمناک تھا۔

اس لیے کسی بھی مقالہ کو آخری شکل دینے سے پہلے اُسے سخت تر...ین تنقیدی نظروں سے گزارنا چاہیے۔ اس کی مناسب جانچ ہی اُسے بہتر اور معیاری بنا سکے گی۔ لیکن معیاری اور اعلیٰ بنانے کا کوئی ایک معیار نہیں ہے اور مختلف اہل نظر اس سلسلہ میں متفق الرائے نہیں ہیں۔ البتہ حسب ذیل طریقے بتائے گئے جو اس کا سدباب کر سکتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی چک لسٹ ہے۔ جس کی مدد سے مقالہ کا معیار طے کیا جا سکتا ہے۔

A (۱) موضوع، اُس کے مسائل اور اُس کے دائرہ کی وضاحت اچھی طرح کی گئی یا نہیں۔

(۲) کیا موضوع سے پیدا ہونے والے مسائل اہم ہیں۔ کیا ان سے پیدا ہونے والے نتائج عملی یا نظریاتی مسائل کا حل پیش کرتے ہیں؟

(۳) کیا مفروضات کی وضاحت اچھی طرح کی گئی ہے۔؟

(۴) کیا مفروضات کسی مدد یا نظریہ سے اخذ کیے گئے ہیں؟

(۵) کیا اس سے پہلے کیے گئے ریسرچ سے موضوع کا رشتہ زیر غور رکھا گیا ہے؟

ڈیزائن (DESIGN) B

(۶) کیا مطالعہ کے مفروضات کی اچھی طرح تشریح کردی گئی ہے؟
(۷) مطالعہ کے حدود کو متعین کیا گیا ہے۔؟
(۸) مطالعہ کے ضروری اجزا کو بیان کیا گیا ہے؟
(۹) ریسرچ ڈیزائن کو مکمل طور سے پیش کیا گیا ہے؟
(۱۰) کیا یہ ڈیزائن مناسب ہے؟
(۱۱) کیا آبادی اور نمونوں کا ذکر ہے؟
(۱۲) کیا SAMPLING کے طریقے ٹھیک ہیں؟
(۱۳) کیا ریسرچ ڈیزائن عام کوتاہیوں اور کمزوریوں سے عاری ہے؟

قاعدے PROCEDURE C

(۱۴) کیا DATA جمع کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے؟
(۱۵) کیا DATA جمع کرنے کا طریقہ مناسب ہے؟
(۱۶) کیا DATA جمع کرنے کے طریقہ سے فائدہ اُٹھایا گیا؟
(۱۷) کیا تمام شہادتوں کی تصدیق کی گئی اور انھیں ثابت کیا گیا؟

تجزیہ ANALYSIS D

(۱۸) کیا تجزیہ کے طریقے درست ہیں اور ان سے ٹھیک کام لیا گیا؟
(۱۹) کیا تجزیہ کے نتائج کی صحیح پیش کش ہوئی؟

F اختتامیہ CONCLUSION

(۲۰) کیا اختتامیہ بخیر و خوبی اپنی منزل تک پہنچا ؟
(۲۱) کیا اختتامیہ کو شہادتوں کی روشنی میں لکھا گیا ؟
(۲۲) وہ کلیہ جو بہت کم مثالوں کی بنا پر قائم کیا گیا ہے (تصحیح ، استفہام) اُس آبادی تک محدود ہے جہاں سے SAMPLE لیے گئے ہیں ؟
(۲۳) کیا رپورٹ ترتیب وار سلیقہ اور تنظیم کے ساتھ لکھی گئی ہے ؟
(۲۴) کیا رپورٹ کا لب و لہجہ سائنسی ہے ؟

ادبی تحقیقات کی چیک لسٹ

A

(۱) مطالعہ کا مقصد
(۲) ریسرچ کا کارنامہ یا موجودہ ادبی سرمایہ میں اضافہ
(۳) مطالعہ کا پس منظر
(۴) سابقہ ریسرچ اور سرمایہ کا مطالعہ

PROCEDURES

(۵) زیر مطالعہ مفروضات کا بیان
(۶) مطالعہ کی حد بندیاں
(۷) اہم اصطلاحوں کی تشریح
(۸) اطلاعات کی فراہمی کے ذرائع کی تلاش

(۹) ذرایع کے انتخاب کا مسئلہ اور طریقہ
(۱۰) مواد حاصل کرنے کے ذرایع کی نوعیت کی خوبی
(۱۱) ڈوکومینٹیشن DOCUMENTATION
(۱۲) معتبر شہادتوں کی صداقت اور تصدیق

B (ANALYSIS) تجزیہ

(۱۳) حقیقتوں کا تجزیہ
(۱۴) مواد کا تنقیدی جائزہ
(۱۵) بحث ومباحثہ کی دلیلیں

C (CONCLUSION) اختتامیہ

(۱۶) نتائج سے متعلق بیانات
(۱۷) اختتامیہ کی شہادت اور ثبوت
(۱۸) رپورٹ کی منطقی ترتیب
(۱۹) تحریر کی خوبیاں

یہ چیک لسٹ دو طرح کی تھی۔ ایک کے ذریعہ سماجی علوم کی تھیسس پر نظر ثانی کی جاسکتی ہے اور دوسرے کا تعلق ادبیات سے ہے۔ ایک کو

EMPIRICAL کہتے ہیں اور دوسرے کو EXPERIMENTAL -
لیکن اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ تھیس کو جانچنے اور نظرثانی کے واحد طریقے یہی ہیں، غلط ہوگا۔ یہ سب اہم نکات ہیں۔ ان میں بہت سی چیزوں کا اضافہ ہو سکتا ہے اور بہت سی باتوں کو اسکالر نظرانداز بھی کر دے سکتا ہے۔ ان کے لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسکالر کم از کم ان باتوں کا خیال رکھے اور یہ دیکھے کہ جن باتوں کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے وہ پوری ہوتی ہیں یا نہیں، اور اگر نہیں ہیں تو دانش مندی کے ساتھ قدم بڑھانا چاہئے۔ عجلت سے گریز کرنا چاہئے۔

تحقیقی رپورٹ

تحقیق اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اُس کی رپورٹ نہ لکھی جائے۔ اس کے ذریعہ اسکالر کے علم کا خزانہ اور معلومات کی دنیا دوسروں تک پہنچتی ہے۔ اگر رپورٹ عام نہ کی جائے تو یہ طالب علم کی معلومات ادھوری، نامکمل اور بے معنی ہوں گی۔ اسی لیے رپورٹ کی تیاری ایک حد تک محقق کے دست ہنر کا منتظر رہتی ہے۔ معلومات اور علم کا سفر تحقیق سے دلچسپی لینے والوں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہ اسکالر کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے نتائج سے اپنے ہم عصروں اور آنے والوں نسلوں کو فیض یاب ہونے کے مواقع فراہم کرے۔

رپورٹ کا ایک بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ عام آدمیوں تک اُن نتائج، خیالات اور تصورات کو پہنچا دے، جو دورانِ تحقیق اُس کے ذہن میں مرتسم ہوئے اور جن اعداد و شمار کی بنیاد پر اُس نے مفروضات بنائے تھے۔ انھیں بھی سامنے رکھ دے۔ تاکہ مفروضات کی بنیاد پر جو نظریات پیش کیے گئے، اُن سے بھی ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق فیض حاصل کر سکے۔ جب میں عام آدمیوں کا ذکر کرتا ہوں تو میرا مقصد موضوع سے متعلق دل چسپی رکھنے والے افراد سے ہوتا ہے۔ سڑکوں پر گھومنے والے ہر کس و ناکس سے نہیں۔ اس لیے رپورٹ لکھتے وقت اسکالر کے ذہن میں دو باتیں ضرور رہتی ہیں۔

(۱) قارئین کیا جاننے کے خواہش مند ہیں، یا انھیں اس موضوع سے متعلق کیا جاننا چاہئے۔

(۲) انھیں کس طرح حاصل شدہ نتائج اور معلومات سے واقف کرایا جائے۔

ادبی اور سماجی علوم دونوں طرح کے شعبوں میں قارئین سے مراد، وہ طالب علم، ریسرچ اسکالر، اساتذہ کرام ہیں، جو موضوع سے دل چسپی رکھتے ہیں جو موضوع سے دل چسپی رکھتے ہیں۔ اُن میں یہ دل چسپی فطری ہوتی ہے، یا اُن کی مصروفیات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے رپورٹ لکھتے وقت حسب ذیل باتوں کی طرف رپورٹ لکھنے والے کا ذہن مرکوز رہتا ہے۔

(۱) ان مسائل کی وضاحت اچھی طرح کی گئی ہو جو موضوع سے متعلق اُبھرتے ہوں۔ یعنی اگر اُردو زبان کے رسم الخط پر کوئی تحقیقی کام ہو رہا ہے تو رسم الخط سے متعلق بہت سی باتیں زیر بحث آئیں گی،

بہت سے مسئلے پیدا ہوں گے اور ہر مسئلہ ایک دوسرے سے مربوط ہوگا۔ اس لیے مسائل کی دریافت اور انھیں حل کرنے کے طریقے بھی اہم ہوں گے۔ اگر ان کی طرف دھیان نہیں دیا گیا تو عمارت کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی ہوجائیگی اور کوئی بھی کی گئی تحقیق سے فائدہ حاصل نہیں کرے گا۔ تحقیق ہی اس لیے کی جاتی ہے کہ سچائی اندھیرے سے روشنی میں آئے اور گمنامی سے صداقت باہر نکلے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیا جائے کہ تحقیق کامیابی کی منزلوں کے بعد بھی سائنس دانوں کی جیب میں فارمولے کی شکل میں پڑی رہتی ہے اور عام انسانوں تک اُس کے فوائد نہیں پہنچے تو وہ کامیاب تحقیق یا انکشافات کی وقعت بے معنی ہوگی لیکن اگر وہی تحقیق بازار میں آگئی تو اب وہ عام انسانوں کے تحفظ اور اُن کے مفادات میں شامل ہوگی۔ اس لیے تحقیق خواہ وہ سماجی علوم کی ہو، یا ادبیات کی، اس لیے کی جاتی ہیں کہ نئی باتیں سامنے آتی رہیں۔ اور علم وفن کے نئے سوتوں سے ہماری آشنائی کا سلسلہ جاری رہ سکے۔

(۲) مسائل کے بعد سب سے اہم شئے اُس طریقہ کار کی تشریح ہے جسے اسکالر نے تحقیق کے دوران استعمال کیا۔ اُس کے موضوع سے متعلق کس طرح اپنے علم کی منصوبہ بندی کی، ڈیزائن ترتیب دیا۔ جب تک علم کی بساط نہ بچھائی گئی ہو اور معلومات کی فراہمی کے منصوبوں کی وضاحت نہ ہوتی ہو، قارئین کے لیے ساری باتوں کو سمجھنا آسان نہ ہوگا۔ وہ یہ نہیں سمجھ پائے گا کہ اعداد و شمار کے حاصل کرنے کے بنیادی ذرائع سے کیوں فائدہ اُٹھایا گیا اور ثانوی ذرائع سے کیوں احتراز کیا گیا۔ پھر مشاہدات کی

توجیہہ کس طرح ہوئی، انٹرویو اور سوال ناموں کی ترتیب کون سے مقاصد کے پیش نظر ہوئی اور کیا تحقیق تجرباتی ہے؟ یا صرف نظریاتی۔ غرض قارئین کے سامنے یہ ساری باتیں وضاحت سے اس کی جانی چاہیے اور اس کی گنجایش رپورٹ ہی میں ہوتی ہے۔ یہ باتیں اگر رپورٹ میں شامل رہیں گی تو قاری ان تجزیہ میں بھی دل چسپی لے گا، جن کی مدد سے اسکالر کسی خاص نتیجہ پر پہنچنا چاہتا ہے۔ ان منزلوں سے گزرنے کے بعد اختتامیہ کی منزل آتی ہے۔

ہر تحقیق چند بنیادی نتائج تک پہنچتی ہے۔ بنیادی نتائج کے بعد ہی تحقیق مکمل ہوتی ہے۔ ادبیات کی تحقیق ہو یا سماجی علوم کی، اس کے بغیر وہ ادھوری رہتی ہے۔

نتائج کے بعد یہ دیکھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ اس سے سابقہ نظریات کو چوٹ پہنچتی ہے یا نہیں، یا سابق نظریات میں ترمیم کی کوئی صورت پیدا ہوئی یا سرے سے نئے نظریات پیدا ہوئے۔ ہر تحقیق کسی نہ کسی نظریہ کی ہمنوائی کرتی ہے یا نئے نظریہ کی تخلیق کرتی ہے۔ چونکہ تجرباتی تحقیق کا فن سب سے زیادہ سائنسی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اُمید کی جاتی ہے کہ وہ یا تو پہلے سے موجود نظریوں کی تصدیق کرے گی یا اُنھیں رد کر کے نئے نظریاتی ڈھانچہ بنائے گی۔

رپورٹ میں موضوع سے متعلق اسکالر اپنی باتیں لکھنے کے پہلے اُس پس منظر کا بھی ذکر کر سکتا ہے جو اُس موضوع پر پہلے سے کسی نے پیش کیا ہو۔ اور جن سے کئی مسائل پیدا ہوتے ہوں۔ اس تناظر کی پیش کش سے نہ صرف اسکالر کو فائدہ حاصل ہوں گے بلکہ اُن لوگوں کو بھی جو موضوع سے دل چسپی رکھتے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ موضوع پر اسکالر نے کن کن زاویوں سے

روشنی ڈالی ہے۔

اس طرح نتائج کو بیان کرنے کے پہلے اُن اصول وضوابط پر نظر ثانی کرنی ضروری ہے جو اختتامیہ اور نتائج لکھنے سے پہلے ضروری ہوتے ہیں۔ اُن تمام شہادتوں کی تفصیل لکھنی ضروری ہے جن کی روشنی میں حقایق کا معروضی جائزہ لیا گیا ہے اور وہ موضوع سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں اور پھر وہ اسکالر کے نقطہ نظر کے عین مطابق ہیں یا نہیں؟ سائنسی طور پر جو رپورٹ تیار کی جاتی ہے اُس میں مقالہ نگار کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی پسندیدہ اشیاء کا اندراج کرے ہر سطر اور نکتہ کی معنویت ضروری ہے۔ ورنہ جتنی باتیں اُس نے رپورٹ میں شامل کی ہیں، اگر معنویت نہیں رکھتیں تو رپورٹ مضحکہ خیز ہو جائے گی۔

ادبی رپورٹ میں ٹیبل فیگر اور گراف کی عام طور پر ضرورت نہیں ہوتی لیکن سماجی علوم کے شعبوں میں اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ ان دنوں بعض حضرات نے ادبی تحقیق میں سائنسی اصولوں کی مدد سے طریقۂ کار کو بدلا ہے اور ٹیبل گراف کے ذریعہ تحقیق کو وہ زیادہ معروضی اور وقیع بنا رہے ہیں۔

یوں تو تحقیق کرانے والے کی ضرورت، ہر قدم پر اسکالر محسوس کرتا ہے۔ لیکن ابتدائی اور آخری منزلوں میں نگراں کی مدد کے بغیر یہ کام بخیر و خوبی مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے رپورٹ تیار کرنے وقت اُس کی ہدایت اسکالر کے ذریعہ ضروری ہو جاتی ہے۔

مختصراً اسکالر کو رپورٹ ایسی تیار کرنی ہوگی جو اُس کے قارئین کو تحقیق کی تمام دشوار گزار راہوں سے واقف کرا سکے۔ ان بنیادی

نکات کی طرف اُن کی توجہ مبذول کرپائے جو دورانِ تحقیق سامنے آئے ہیں۔

رپورٹ کی اسٹائل کا مسئلہ بھی اسی سے وابستہ ہے۔ رپورٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ عبارت صحت اور صفائی کے ساتھ لکھی جانی چاہیے۔ یہ طے کرلینے کے بعد کے مطلوبہ اطلاعات کون کون سی ہیں اور اُن میں کیا ربط ہے، اُنھیں بالترتیب لکھنا چاہیے۔ سب سے پہلے اُس کا ایک رَف نوٹس یا خاکہ تیار کرنا ضروری ہے۔ یادداشت کی بنیاد پر مقالہ کی رپورٹ نہیں لکھی جاتی۔ اور رف نوٹس بنانے کے لیے ذہن کو مقالہ کے تمام ابواب میں شامل اطلاعات، طریقۂ کار اور تجزیہ کی طرف مرکوز رکھنا ہوگا۔ اس لیے غلطیوں کے امکانات کم رہ جاتے ہیں اور اس کی گنجایش بھی نہیں رہتی کہ کوئی ضروری پہلو نگاہوں سے اوجھل ہوجائے۔ خاکہ بنا لینے سے تمام ابواب کی موٹی موٹی باتیں سامنے رہتی ہیں اور ان کے باہمی رشتہ کی طرف بھی مقالہ نگار کی توجہ قائم رہتی ہے۔

رَف نوٹس یا خاکہ بنا لینے کے بعد اُسے کئی بار پڑھنا چاہیے اور مقالہ کے تمام ابواب کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنا چاہیے کہ کوئی اہم نکتہ چھوٹ تو نہیں گیا۔ یہ سب ہوجانے کے بعد آسان اور عام فہم زبان میں رپورٹ لکھنی چاہیے۔ رپورٹ اور مقالہ کی زبان میں فرق ہوسکتا ہے۔ مقالہ کی زبان ایک خاص معیار کا مطالبہ کرتی ہے۔ تکنیکی اصطلاحوں کے بغیر کوئی بات آگے نہیں بڑھ سکتی لیکن رپورٹ کے لیے ضروری نہیں کہ ادق الفاظ اور اصطلاحوں میں گفتگو کی جائے۔ اس لیے اسٹائل کو قدرے پُرکشش بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حالانکہ اسٹائل کا مسئلہ اتنا مشکل اور پیچیدہ ہوتا ہے کہ جب تک مقالہ نگار زبان پر عبور نہیں رکھتا وہ اپنے خیالات کو قاری کے سامنے صحت اور صفائی کے نہیں پیش کرسکتا۔

کتابیات

1. CAMPBELL, DONALD, T., AND STANLEY JULIAN. EXPERIMENTAL AND QUASI EXPERIMENTAL DESIGNES FOR RESEARCH (CHICAGO) - RAN MC NALLEG 1963
2. HOLSTI, OLER. CONTENT ANALYSIS FOR THE SOCIAL SCIENCE AND HUMANITIES
3. SELTIZ, ROBERT. EXPERIMENTER EFFECTS IN BEHAVIOUR RESEARCH.
4. SUCHMAN, EDWARD. THE PRINCIPLE OF RESEARCH DESIGN AND ADMINISTRATION
5. ABEL, T. WHY HITLER CAME INTO POWER
6 DO. THE NATURE AND USE OF BIOGRAMS
7. BLUMER, H. AN APPRAISAL OF THOMAS AND ZNANIECK'S "THE POLISH PEASANT IN EUROPE AND AMERICA

8. CAMPBELL, A. THE USE OF INTERVIEW IN FEDERAL ADMINISTRATION

9. BEVERIDGE, W.I.B THE ART OF SCIENTIFIC INVESTIGATION

10. LUDBERG, G.A. SOCIAL RESEARCH

11. KAUFMANN, F. THE METHODOLOGY OF SOCIAL SCIENCES

12, CAMPBELL, N. WHAT IS SCIENCE

13. WEBER, MAX: THE METHODOLOGY OF SOCIAL SCIENCE

14. MADGE, JOHN. THE TOOLS OF SOCIAL SCIENCE

15. ACKOFF, R.L. THE DESIGN OF SOCIAL RESEARCH

16. C.M. JAHODA. M: DEUTSCH AND S. COOK RESEARCH METHODS IN SOCIAL RELATIONS

17. GOODE, W.G. AND P.K. HATT- METHODS IN SOCIAL RESEARCH

18, GALTEENG, JOHN: THEORY AND METHODS OF SOCIAL RESEARCH

19, PARTEN, M.B. SURVEIYZ, POLLS AND SAMPLES.

20. ALBAUGH, R.W. THESIS WRITING: A GUIDE TO SCHOLARY STYLE

21. BERRY, R. O. PREPARING THESIS - AND OTHER TYPED MANUSCRIPT

22. CAMBELT, W. G. FORM & STYLE OF THESIS WRITING

23, COOPER, B. C. WRITING TECHNICAL REPORTS

24. TURABIAN, KATE L. A MANUSCRIPT FOR WRITERS OF TERMS PAPER, THESIS AND DISSERTA-TIONS

مُصنّف کی دُوسری کتابیں

۱۔ زنداں کی ایک رات	افسانوی مجموعہ
۲۔ علامہ	تحقیق
۳۔ خوں بہا	ناولٹ
۴۔ اُردو افسانوں میں لسبین ازم	تنقید
۵۔ شناخت	افسانہ نگار خواتین کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ
۶۔ سوفوکلیز	ایک تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

ملنے کا پتہ

CENTRE FOR SCIENTIFIC STUDIES
AND CULTURE
K. 106 H.S.L. COLONY
RANCHI-2.